

دستِ آسمانی ہنگاموں سے بھر پور سنسنی خیز ناول

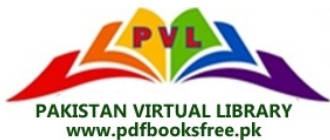
# پُر اسرار شکاری

ایم الیاس



PDFBOOKSFREE.PK





میرے ڈھاکا ایئر پورٹ پر قدم رکھتے ہی خونی کھیل کا آغاز ہو گیا تھا۔

میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میرا استقبال اس سنسنی خیز انداز سے ہو گا۔ میں طیارے سے اتر کر دوسرے مسافروں کے ساتھ لاؤنج کی طرف بڑھتا ہوں نے لاؤنج کے باہر دروازے کے پاس اپنے دیرینہ دوست انور ندیم اور پریس کلب کی سیکرٹری اور روزنامہ اتفاق کی کالم نویس مس نجم النہار کو کرشنا پورا کے پھولوں کے ساتھ اپنے استقبال کے لئے موجود پایا۔ میں اس مرتبہ تین برس کے بعد ڈھاکا آیا تھا۔ ان کے لبوں پر تبسم کی کلیاں چٹک رہی تھیں۔

جب میں ان کے قریب پہنچا تو سب سے پہلے انور ندیم نے آگے بڑھ کر میرے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا، پھر وہ بڑی گرمجوشی سے مجھ سے بغلیں ہو گیا پھر نجم النہار اپنا دلکش تبسم مجھ پر نچھاور کرتی ہوئی میرے قریب آئی اس نے اپنے خوبصورت ہاتھوں سے میرے گلے میں ہار پہنایا، سلام کیا اور پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھایا۔ اس ہاتھ کا لطیف لمس میری رگ رگ میں بجلی کی لہر بن کر اتر گیا اس نے اپنی بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔

میں نے نجم النہار کو اوپر سے نیچے تک دیکھا جو بنگالی حسن کا نادر نمونہ تھی۔ ان تین برسوں میں اس کا حسن اور دلربا ہو گیا تھا وہ کوئی نو عمر لڑکی نہ تھی بلکہ تیس برس کی عورت تھی۔ سرخ کناروں کی سفید ساڑھی اور سفید بلاؤز میں لمبوس تھی۔ چہرہ میک آپ سے عاری تھا۔ لمبے لمبے سیاہ ریشمی بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اسے اتنے دلکش انداز میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی سادگی میں بڑا حسن تھا۔

وہ مجھے اپنی طرف اس طرح دیکھتے پا کر سرخ ہو گئی اس نے دل فریب انداز سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”اس طرح مجھے کیوں دیکھ رہے ہو؟ کیا میں بہت بوڑھی ہو گئی ہوں؟“

”نہیں.....“ میں نے جواب دیا۔ ”تم اپنی عمر سے دس برس چھوٹی لگ رہی





کی بو محسوس ہوئی بلکہ میری چھٹی حس بیدار ہو گئی۔

لوڈر میرا سامان لئے آگے آگے تھا اور کارپارنگ لاث کی طرف جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ انور ندیم تھا۔ پارنگ لاث پر نجم النصار کی گاڑی کھڑی تھی، میں اور نجم النصار ان دونوں کے پیچھے پیچھے چندہ میں قدم پر تھے۔ ہم دونوں باتیں کرنے میں ایسے منہمک تھے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ نجم النصار کو اچانک کسی چیز سے ٹھوکر لگی تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی وہ گرنے لگی تو میں نے سرعت سے اس کا بازو پکڑ لیا اس نے ایستادہ ہوتے ہوئے سامنے کی طرف دیکھا تو ایک دم الجھل پڑی پھر اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مجھے ایک طرف دھکا دیا اور خود بھی دوسری طرف ہو گئی۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا زمین پر گر پڑا۔

فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، میں حیران تھا کہ نجم النصار نے مجھے دھکا کیوں دیا؟ میں سوچ رہی تھی کہ تھا کہ وہ پوری قوت سے بڑی انداز سے چیخا۔ ”سالارا..... اپنے آپ کو بچاؤ وہ بد معاش نجم پر غارت کرنے والا ہے۔“

نجم النصار نے جس طرف اشارہ کیا تھا میں نے اس سمت دیکھا تو سن سا ہو گیا، خوف کی لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی وہ بد معاش جسے میں نے کسم ہال میں دیکھا تھا اور جو ابھی مورس گاڑی کی طرف لپکا تھا وہ اس گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھا کھڑکی میں سے بندوق کی نال میری طرف کر کے شست باندھ رہا تھا۔ پھر میں بغیر کسی تاخیر کے ایک طرف زمین پر گیند کی طرح لڑھکتا ہوا ستون کی طرف دوڑا، اس نے ایک فائر داغ ڈال کر میرے سر پر سے سنٹائی ہوئی گزرجی کر دوسرے لمبے ایک دل خراش چیخ فضا میں گونجی یہ گولی کسی اور کے جا کر لگی تھی۔ میں تیزی سے اٹھ کر ستون کی آڑ لے لیا۔ بھاگ۔ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ستون کی آڑ میں نہ ہو جاتا تو دوسری گولی میرے لئے فرشتہ اجل ثابت ہوتی۔ دوسری گولی ستون سے ٹکرائی اور نہ جانے کدھر جا کر گئی میں نے بائیں جانب دیکھا بجلی گولی کا نشانہ ایک عیسائی ڈرائیو رہتا تھا۔ گولی اس کی ران کے گوشت کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی وہ زمین پر کسی زخمی پرندے کی طرح تکلیف سے ترپ رہا تھا۔

اس بد معاش نے جب یہ دیکھا کہ میں اس کے حملے سے بال بال بچ گیا ہوں اور میری بجائے دوسرا شخص اس کی گولی کی زد میں آ گیا ہے اور اس کا دوسرا فائر بھی خالی گیا ہے تو اس نے نجم النصار کو اپنے نشانے کی زد میں لے لیا جو زمین سے اٹھ کر حد درجہ خائف اور رجواں بنانے ہو کر کارپارنگ لاث کی طرف بھاگ رہی تھی۔ اس بد معاش نے اچانک ہی

نجم النصار کا نشانہ بن لیا تھا۔ اس غیبت بد معاش نے فائر جھوک دیا تو گولی نجم النصار کے شانے پر جا کر لگی اور وہ کسی انوکھی طرح ٹھوم کر قریب کھڑی گاڑی کے بوٹ پر منہ کے بل جا کر گئی، پھر اس کے منہ سے ایک دل دوز چیخ نکلی اور فضا میں دور تک گونج گئی پھر وہ گاڑی کے بوٹ پر سے پھسلتی ہوئی زمین پر ٹکرائی۔ اس کے شانے سے خون کا ایک فوارہ ابل پڑا اور اس کے لباس کو خون سے تر کرنے لگا۔

اس گاڑی میں ایک نہیں دو بد معاش تھے، دوسرا بد معاش تو میسرنگ پر بیٹھا تھا، ان بد معاشوں نے شاید سمجھا کہ نجم النصار کا کام تمام ہو گیا ہے۔ ان کی گاڑی ایک جھٹکے سے بڑھ کر اس نے بڑی تیزی سے ایک چکر کاٹا اور میں روڈ کی طرف پوری رفتار سے چل پڑی۔ میں نفرت اور غصے سے اندر رہی اندر چیخ و تاب کا تارہہ گیا۔ میری جیب میں ریو الور تھا لیکن وہ کسی کام کا نہیں تھا اس لئے کہ اس کی گولیاں سوٹ کیس میں تھیں، میرا ریو الور بھرا ہوا تا تو دونوں بد معاشوں میں سے کوئی بھی اپنی جان بچا کر جانیں سسکا تھا۔

یہ غوثی واقعہ چشم زدن میں پیش آیا تھا۔ سیکورٹی گاڑی اور مسلح پولیس کے سپاہی حیرت سے دیکھتے اور سوچتے رہ گئے تھے۔ جب تک انہیں ہوش آیا اور وہ اس گاڑی کے پیچھے لپکے اتنی دیر میں ان بد معاشوں کی گاڑی یہ جاؤہ جا۔ دوسرے لمبے وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی پولیس کی جیب ان کے تعاقب میں روانہ ہوئی۔ مجھے پولیس سے اس غفلت، سست روی اور بے پروائی کی قطعی امید نہیں تھی۔ پولیس تیزی دکھائی تھی تو رشوت لینے اور شریف اور بے گناہ آدمیوں کو کر غارت کرنے میں۔

میں کو نہ این کر نجم النصار کی طرف لپکا، وہ گزشتہ پانچ برسوں سے میرے بہترین، مخلص اور بے حد بے تکلف دوستوں میں سے تھی اور میری کتابوں اور میرے کارناموں کی جذباتی حد تک قدردان تھی۔ آج اب وہ میری محسن بھی ہو گئی تھی۔ آج اس کی وجہ سے میں موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ وہ غریب میری ہی وجہ سے ان درندوں کی گولی کا نشانہ بن گئی تھی۔ اسے زخمی حالت میں بے ہوش دیکھ کر میرا دل حد سے بے چارے پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر اس کی نبض دیکھی تو وہ چل رہی تھی اس کے زخم سے بہت سا خون بہہ گیا تھا اور ریز نہیں ہو تھا۔

اور اس بد معاش کی فائرنگ سے انٹرویوٹ کی عمارت کے باہر فضا میں چیخ دھکا اور ایک بجھک لڑجھک مچی تھی۔ سب دہشت زدہ ہو گئے تھے جس کا منہ ہر کدھر تھا وہ اس طرف بھاگا۔ عمارت کے اندر بھی خوف و ہراس پھیل گیا تھا اس لئے کوئی مسافر باہر نہیں نکلا تھا۔

کے اپنی جیب سے گاڑی کی چابیاں نکالیں اور اپنے ساتھی کی طرف بڑھا دے ہوئے بولا۔  
 ”اور میں! جلدی سے میری گاڑی لے آؤ، جانتے ہو یہ عورت کون ہے، ’مس نجم النصار‘  
 روزنامہ اتفاق کی کالم نویس.....“  
 ”نہیں.....“ وہ حیرت سے اچھل پڑا اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”یہ  
 عورت تو ہمارے بارہ بجادی ہے۔“

وہ گاڑی لانے کے لئے جلدی سے پارک لٹ کی طرف دوڑا گیا اس کی گاڑی  
 آنے سے پہلے انور ندیم آگیا۔ ”میں نے ہسپتال ٹیلی فون کر دیا ہے۔ اول تو وہ یہ کیس لینے  
 کے لئے تیار نہیں تھے جب میں نے نجم النصار کے بارے میں بتایا تو ان کے دماغ درست ہو  
 گئے۔ ایسپرنس دس منٹ میں پہنچ رہی ہے۔“  
 ”اسپرنس کی گاڑی بھی آ رہی ہے اس میں لے چلتے ہیں۔“ میں نے انور ندیم سے کہا  
 پھر اسپرنس بولا۔ ”آپ اس غریب عیسوی ڈرائیور کو بھی فوراً ہسپتال پہنچادیں.....  
 معلوم نہیں اس غریب کی کیا حالت ہے؟“

”وہ بے ہوش پڑا ہے۔“ انور ندیم نے کہا۔  
 ”آپ اس کی فکر نہ کریں سرکاری ہسپتال کی ایسپرنس آئے گی اور اسے لے جائے  
 گی۔“ اسپرنس نے بے پروائی سے اپنے شانے اچکائے۔ ”ہمیں ’مس نجم النصار‘ کی فکر ہے  
 اس لئے کہ ان کی پہنچ سب سے زیادہ ہے۔“  
 ”آپ کو اس عیسوی ڈرائیور کی فکر اس لئے نہیں ہے کہ اس کی کوئی پہنچ نہیں۔“  
 میں نے اس پر طنز کیا۔

”جی..... جی یہ بات نہیں ہے۔“ وہ جھینپ سا گیا۔ ”میں ایک بات کہہ رہا  
 تھا۔“

”آپ کو شاید نہیں معلوم کہ یہ عیسوی ڈرائیور ’مس نجم النصار‘ کا ڈرائیور ہے اگر آپ  
 نے اسے فوری طور پر طبی امداد نہیں پہنچائی تو پورے شرکی پولیس کی خیر نہیں ہوگی اب  
 آپ جانیں آپ کلام.....“

”آپ ایسا کریں۔“ انور ندیم نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ”آپ اس غریب عیسوی  
 ڈرائیور کو اپنی گاڑی میں ڈال کر ہسپتال پہنچیں ہم انہیں اپنی گاڑی میں لے آتے ہیں۔  
 خون بند نہیں ہو رہا ہے۔“

”ٹھیک.....“ اسپرنس نے سر ہلایا۔ ”ہم اسے سرکاری ہسپتال پہنچا دیتے ہیں۔“

انور ندیم ہانپتا میرے پاس آیا اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔  
 ”میں کس ہسپتال کو ٹیلیفون کر کے ایسپرنس منگوا تا ہوں۔“ انور ندیم نے دل گرفتہ  
 لہجے میں کہا۔ ”ادھر میرے خدا یہ کیا ہو گیا؟“  
 ”یہ پولیس کا کام ہے پھر بھی تم کسی اچھے پرائیویٹ ہسپتال کو ٹیلیفون کر کے اس کی  
 ایسپرنس منگواؤ۔ جاؤ جلدی کرو.....“

انور ندیم ٹیلی فون کرنے کے لئے عمارت کے اندر لپک گیا اس کے جاتے ہی دو  
 پولیس افسر آگئے ان میں سے ایک بولا۔ ”اس بد معاش نے شاید آپ پر گولیوں چلائی  
 تھیں؟“

میں نے ان کی طرف گھور کر غصے سے دیکھا۔ ”اور آپ یہ غوثی تماشا دیکھتے رہے؟“  
 ”ہم اندر تھے۔“ دوسرے نے جواب دیا۔ ”ایک شخص نے ہمیں بتایا۔ کیا آپ ان  
 بد معاشوں کے بارے میں کچھ جانتے ہیں کہ وہ کون تھے اور انہوں نے کس لئے آپ پر  
 فائرنگ کی تھی؟“

”میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ہوں کہ وہ کون تھے اور انہوں نے کس لئے  
 مجھ پر حملہ کیا تھا۔“ میں تند لہجے میں بولا۔ ”میں کراچی سے آج ہی اور اسی فلائٹ سے آیا  
 ہوں جس فلائٹ کے مسافر ہارنکل رہے ہیں۔“

”آپ کراچی سے آئے ہیں؟“ اس کے لہجے میں حد درجہ حیرت تھی شاید اس لئے  
 کہ میں بنگلہ زبان بڑے صاف شستہ لہجے میں بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ ”کیا آپ بنگالی  
 نہیں ہیں؟“

”جی نہیں.....“ میں براہم ہو گیا۔ ”آپ دیکھ نہیں رہے یہ بے ہوش اور  
 شدید زخمی ہیں اور انہیں فوری طبی امداد کی سخت ضرورت ہے، آپ ہیں کہ اس بات کی  
 ذرا بھی پروا نہ نہیں کر رہے۔“

”کیا یہ خاتون آپ کی اہلیہ ہیں؟“ ایک نے مجھ سے پوچھا، دوسرا اس بھیڑ ہونٹانے لگا  
 جو ہمارے گرد جمع ہو رہی تھی۔

”جی نہیں.....“ میری میزبان اور روزنامہ اتفاق کی کالم نویس ’مس نجم النصار‘  
 غونڈ کر رہیں۔“

”ادھر.....“ پولیس افسر کا چہرہ خنجر ہو گیا اور اس کی جیسے سنی ہم ہو گئی۔ ”یہ  
 ’مس نجم النصار‘، آپ ایسا کریں انہیں میری گاڑی میں لے چلیں۔“ اس نے توقف کر

تھے پولیس اور خفیہ پولیس کے ادارے سر توڑ کوشش کے باوجود بھی ان کی گمشدگی کا پتہ نہیں چلا سکے تھے۔ ان کی لاشیں تک و ستاب نہیں ہو سکی تھیں، ان میں ہر توارتیر غیر ملکی شکاری تھے جو سمندر میں شکار کے لئے آئے تھے، وہ ڈھاکا سے ایک سٹیئر میں سمندر کے لئے روانہ ہوئے تھے، سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ سفر کے دوران سٹیئر سے غائب ہو گئے تھے۔ ان کے کردار میں سامان موجود تھا لیکن ان کا پتہ نہیں چلا تھا۔

ان غیر ملکی شکاریوں کی پراسرار گمشدگی پر ان کی حکومتوں نے جگہ دیش کی حکومت کو بلا کر رکھ دیا تھا۔ ابو سرکار احمد کے مدد سے گہرے مراسم تھے، ان کی خواہش تھی کہ میں یہاں آؤں تو دونوں مل کر ان لاپتہ شکاریوں کا پتہ لگائیں جن کی گمشدگی سے خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ میری ساتویں کتاب ”دسواں شکار“ جو شکار کے انتہائی سنسنی خیز اور حیرت انگیز واقعات پر مشتمل تھی، اس کا بیگم ایڈیشن بھی شائع ہوا تھا، میری یہ کتاب انگریزی زبان میں شائع ہوئی تھی اور اس کا بیگم ترجمہ میرے بچپن کے دوست انور ندیم نے کیا تھا اور اس کی تقریب رونمائی ڈھاکا کے پریس کلب میں میں نومبر کو منعقد ہونے والی تھی۔ شکار کے موضوع پر میری کتابیں لندن کا ایک بہت بڑا پبلشر جھاپا تھا اور اس کا ترجمہ تقریباً دنیا کی ہر زبان میں چھپتا تھا، میری ہر کتاب کے دس سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے تھے اور بھی شائع ہو رہے تھے۔ یہ میرا ذریعہ آمدنی تھا اور ان کتابوں کی بدولت میں آج ایک دولت مند آدمی بن گیا تھا مجھے ہر مہینے مختلف ممالک کے پبلشرز کی جانب سے ہزاروں روپے کی رقم رائٹنگ کے طور پر وصول ہوتی رہتی تھی۔ آج میں دنیا کے بہترین شکاریوں میں شمار کیا جاتا تھا اور میرے کارناموں کی ساری دنیا میں دھوم مچی ہوئی تھی۔

میں ان تمام برسوں کے عرصے میں لاپتہ تصور اور افتراق کے جنگلوں میں شکار کر کے کراچی، پٹانچانگا، ابو سرکار احمد کا خط ملاؤ میرے ساتھ ملا یا اور میسور میں تھے، جہاں ہم نے شیر ہر اور دیو قامت تیندڑوں کا شکار کیا تھا۔ اب یہاں ایک ایسے شخص کا شکار کرنا تھا جو شکاریوں کا شکار کر رہا تھا، ایک بات میری سمجھ سے بالاتر تھی کہ نادیہ دشمن کو شکاریوں سے ایسی کیا دشمنی تھی۔ ڈھاکا کے ایئر پورٹ پر جو واقعہ پیش آیا تھا اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ نادیہ دشمن میری آمد سے خوفزدہ ہے اس لئے اس نے مجھے ایئر پورٹ ہی پر ہلاک کر دینے کا منصوبہ بنایا تھا جو ختم الشکاری وچ سے بری طرح ناکام رہا تھا۔ ایک دوسری بات یہ

”جی نہیں اسے ہمارے والے ہسپتال ہی لے آئیں اس کے علاج کے اخراجات ہم برداشت کریں گے۔“ میں نے کہا۔

ہم نے ایسپولیس کا انتظار نہیں کیا، میں نے نجم الشمار کا پرس انور ندیم کو دیا اور نجم الشمار کو اٹھا کر گاڑی کی طرف بڑھا اور ہراسپولیس کی گاڑی بھی اس نیکی ڈرائیور کی طرف بڑھی، تھوڑی دیر کے بعد ہماری گاڑیاں راستے میں تھیں تو کئی ایسپولیس ایئر پورٹ کی طرف تیز رفتاری سے جا رہی تھیں، میں نے نجم الشمار کو گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹا کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اس کے زخم پر دوا مل تہ کر کے رکھ دیا تھا کہ خون زیادہ نہ بے۔ وہ نیم بے ہوش کی حالت میں تکلیف سے بری طرح کرا رہی تھی۔

ہسپتال پہنچتے ہی ان دونوں کو فوراً آپریشن ٹیمز میں لے جایا گیا تھا، اس ہسپتال میں چوٹی کے ڈاکٹر اور بہترین موجود تھے۔

نجم الشمار کی ماں، بہن شمس الشمار اور بھائی تنزیل الرحمن ہسپتال پہنچ گئے، انور ندیم نے انہیں ٹیلیفون کر دیا تھا، وہ سب بہت پریشان اور غمزدہ تھے۔ سرجن نے آپریشن ٹیمز سے باہر آ کر بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے، گولی شانے میں پیوست ہو گئی تھی وہ نکال لی گئی ہے۔ مریضہ کی حالت خطرے سے باہر ہے، یہی اس نیکی ڈرائیور عبدال کے بارے میں بتایا گیا۔ ان دونوں کو خون دیا گیا تھا، اتفاق سے میرا اور نجم الشمار کا ایک ہی گروپ تھا۔ چونکہ تین بولٹ خون کی ضرورت تھی اس لئے بھائی بہن کے علاوہ مجھ سے بھی لیا گیا تھا۔

میں جب کبھی بھی ڈھاکا آتا تھا نجم الشمار کے پاس ہی ٹھہرتا تھا۔ اس لئے کہ وہ لوگ مجھے اپنے ہی گھر کا فرد سمجھتے تھے، اس گھر سے قریبی اور دیرینہ مراسم اس لئے تھے کہ ماضی میں جب جگہ دیش نہیں بدلتا تھا یہ لوگ ہمارے پڑوسی تھے اور نجم الشمار میری چھوٹی بہن کی کلاس فیلو بھی رہ چکی تھی، میں نجم الشمار کے پاس رات کو رکتا چاہتا تھا مگر اس کے گھر والے نہیں مانے۔ شمس الشمار اس کے پاس رک گئی یوں بھی اس کے ڈرپ گئی ہوئی تھی اور نیند کا انجمن دیا ہوا تھا، صبح سے پہلے اس کا ہوش میں آنا ممکن نہیں تھا اس کے گھر والے مجھے ساتھ لے گئے تو انور ندیم بھی چلا آیا۔

اس مرتبہ جوں جوں جگہ دیش آیا تو صرف شکار کے لئے نہیں آیا بلکہ خاص طور پر مجھے میرے شکاری دوست ابو سرکار احمد نے مدعو کیا تھا۔ اس مرتبہ شکار کھیلنے کے بجائے ان سات آٹھ مشہور شکاریوں کو تلاش کرنا تھا جو دس سال کے اندر پراسرار طور پر لاپتہ ہو گئے



”وہ کل یہاں تمہارے استقبال کے لئے منگا پور سے پہنچنے والے تھے مگر پہنچ نہ سکے بلکہ بنگالہ صدر مملکت کے کسی کام سے چلے گئے ہیں۔ تین چار دن میں ان کی واپسی متوقع ہے۔“

میں اور انور ندیم صبح ہسپتال پہنچے تو نم الٹار ہوش میں تھی۔ اس کی حالت قدرے بہتر تھی لیکن خون زیادہ بہہ جانے سے اس پر نقاب طاری تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے زرد چہرے پر دلفریب مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”نم الٹار بولی۔“ جس سے اسے ہوش آیا ہے آپ ہی کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔ اب تک کوئی تیس مرتبہ پوچھ چکی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ آپ بھی دشمن کی فائزنگ سے زخمی ہو کر کسی ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ اب اسے میری بات کا یقین آیا ہو گا۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس نے میرے بارے میں ایک مرتبہ بھی پوچھا ہو گا۔“ میں نے ہنسر پر نم الٹار کے پاس بیٹھنے ہوئے کہا۔

”وہ کیوں.....؟“ جس الٹار کے چہرے پر گہرا استعجاب چھایا۔

”کیوں اور کس لئے..... تم خود ہی اس سے پوچھ لو..... اگر اسے میرا اتنا خیال ہو تا تو پھر کیا کتا.....“

نم الٹار کے چہرے پر سرفی لہریں کر دوڑ گئی۔ وہ تھکتا سے بولی۔ ”بہتر ہے کہ اب تم کالم نوکسی شروع کر دو۔“ تھوڑی دیر کے بعد جس الٹار اپنے گھروالوں کا گلی فون سننے کے لئے چلی گئی۔ انور ندیم ڈاکٹر سے ملے اور اس کی رپورٹ معلوم کرنے گیا تو ہم دونوں کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھا وہ مجھے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک نور سا چھایا۔

”تمہاری آنکھیں تو کچھ اور کم رہی ہیں؟“ میں اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بولا۔

”کیا.....؟“ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں بھی پھیل گئی۔

”وہی جو تمہاری زبان سمجھتی نہ تھی؟“

”عورت کی زبان ہی اس کی آنکھیں ہوتی ہیں۔“ وہ رک رک کر کہنے لگی۔ ”تم شکاری، نگاہوں کی زبان سمجھتی نہ تھی؟ اب چونکہ تم شاعر بننے جا رہے ہو اس لئے آنکھوں کی زبان کا مفہوم بھی سمجھنے لگے ہو۔“

میرے لئے حیران کن تھی کہ ناؤیہ دشمن کو میری آمد کی خبر کیے ہو گئی۔ میں نے اپنی اس حیرانی کا اظہار انور ندیم سے کیا تو اس نے بتایا ہم الٹار نے تمہاری آمد کی خبر ملک کے تمام اخبارات میں شائع کرادی تھی اور اس خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تم شکاریوں کی نہ اسرار کشمندی کا کھوج لگے آ رہے ہو۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ ان شکاریوں کو کس لئے اغوا کیا جا رہا ہو گا.....؟“ میں نے پوچھا۔

”صرف شکاری ہی نہیں بہت سارے غریب اور خوبصورت جوان مرد، لڑکیوں اور عورتوں کو بھی اغوا کیا جا چکا ہے۔“ انور ندیم نے جواب دیا۔ ”ان سب کی نہ اسرار کشمندی بھی ایک معرہ ہے۔ اغوا ہونے یا لاپتہ ہونے والوں کی لاشوں تک کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔“

”کس ایسا تو نہیں کہ کوئی بین الاقوامی گروہ انہیں اغوا کر کے پڑوسی ملک کے بیگار کیپوں میں پہنچا رہا ہو؟“

”اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔“ انور ندیم نے کہا۔ ”سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سینئر سے جب کہ وہ اپنا سفر طے کر رہے ہوں شکاریوں کا لاپتہ ہو جانا حیرت انگیز اور ناقابل یقین ہے ایسا لگتا ہے کہ انہیں جادو کے زور سے غائب کر دیا جاتا ہے۔“

”میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرا دشمن مجھے سینئر سے کیسے غائب کرتا ہے؟ اس نے ایک شیر ببر کو چھیڑ کر اچھا نہیں کیا۔“

”سالار! تم ذرا ہوشیار اور محتاط رہنا۔“ انور ندیم نے مشورہ دیا۔ ”تم پر دوبارہ قاتلانہ حملہ ہو سکتا ہے۔ دشمن اپنی ناکامی پر جکی محسوس کر رہا ہو گا تمہاری زندگی ہم سب کو بے حد عزیز ہے۔“

”یہ ناؤیہ دشمن کون ہو سکتا ہے؟ جو بھی ہے وہ ایک ذہین، بے حد ہوشیار اور خطرناک شخص ہے۔ وہ جو بھی ہو اور کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو مکافات عمل سے بچ نہیں سکتا۔“

”اس کی وجہ سے پورے ملک میں خوف و ہراس پھیل رہا ہے اور غیر ملکی شکاریوں نے یہاں آنا بند کر دیا ہے۔“

”ابو سرکار احمد تک وطن واپس لوٹ رہے ہیں؟“

کا وقت ہو رہا تھا۔ اس کی طبیعت کے جگزنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کے بورڈ نے مختلف رپورٹیں دیکھنے کے بعد کل ہسپتال سے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ بچے کو کوئی ٹیلی فون کی ٹھنکی مسلسل بجنے کی آواز سن کر بیدار ہو جائے گا اور ٹیلی فون پر بات کر لے گا۔ چند لمحوں تک کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا، میں نے ایک لمحے کے لئے ٹیلی فون کی طرف دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔ میں نے ریسیور کو کان سے لگا کر پیلو کی کما تھا کہ دوسری طرف سے ایک حزن منی آواز لہرائی جس میں بلا کا کرب اور دکھ جھلک رہا تھا۔ ”کیا یہ مس نجم التناہر کا کان ہے؟“

اس کالب و لوبہ پر اصاف و شہر تھا۔ اس کے لہجے کی غماضت اور بات کرنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی بڑے ہسپتال کی تربیت یافتہ نرس ہے۔ نہ جانے کیوں میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میرا دلگ تھین میں بدل گیا کہ یہ ٹیلی فون ہسپتال سے آیا ہے۔ میں نے مرہدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”جی ہاں!..... فرمائیے؟“

”کیا میں مسٹر سالار احمد سے بات کر سکتی ہوں؟“ اس نے مؤدبانہ انداز سے کہا۔  
”جی..... میں سالار ربول رہا ہوں۔“ اس انجینیئر لڑکی کی زبان سے مجھے اپنا نام سن کر بڑی حیرت ہوئی۔

”اوہ..... میرے خدا ایترا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ سے رابطہ قائم ہو گیا۔“  
اس نے جیسے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

یہ جان کر کہ یہ ٹیلی فون ہسپتال سے کسی نرس کا نہیں ہے بلکہ کسی اور لڑکی کا ہے اور وہ تنگ کرنے اور تفریق لینے کی غرض سے رات کے تین بجے ٹیلی فون کر رہی ہے، ایک طرف اطمینان سا مہر اور دوسری طرف مجھے اس کے ناوقت ٹیلی فون کرنے پر سخت غصہ آیا۔ اخبارات کے ذریعے سے یہ خبر ہر کسی کے علم میں تھی کہ میں نجم التناہر کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں۔ اس لئے اس لڑکی نے ادھر کا نمبر گھما دیا تھا۔

”یہ کوئی وقت ہے ٹیلی فون کرنے کا.....“ میں غصے سے بھوک اٹھا۔  
”آئی ایم ویری ویری سواری.....“ وہ معذرت سے آہستہ لہجے میں گونگوائی۔  
”آپ سے ایک بھد ضروری بات کرنا تھی۔“

”اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں.....“ میں نے حیرت اور غصے سے کہا۔  
”یہ وقت ایک شریف آدمی کے سونے کا ہو تا ہے۔ آپ بھی مجھے ٹیلی فون کر سکتی تھیں؟“  
”اگر اتنی اہم اور ضروری بات نہ ہوتی تو میں آپ کو رات دس بجے ہی ٹیلی فون کر

”تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اسے ساری زندگی بھلا نہیں سکتا..... تم نے میرے لئے اپنی جان کی پروا بھی نہیں کی۔“  
”کیا مجھے اتنا عجیب حق نہیں ہے کہ میں تمہارے لئے اپنی جان دے سکوں؟“ اس کی حسین آنکھیں پُر غم ہو گئیں۔  
”اس منہ سے واپس آنے کے بعد تمہیں سدا کے لئے اپنانے کی مہم..... سر کر کے رہوں گا۔“

فرط حیا سے اس کا چہرہ تھما اٹھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ”تم سدا ہی سے میرے دل کے نماں خانے میں بیٹے ہوئے ہو۔“  
انور ندیم بچے آواز دار و زانوہ کھول کر کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ جیسی جس التناہر بھی آئی تھی۔ اس نے آتے ہی انور ندیم سے پوچھا۔ ”تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ کیا دیکھ رہے ہو؟“

”ایک طرف شیر کے حکاری کو محبت کا شکار کھیلتے دیکھ رہا ہوں۔ دوسری طرف ایک کالم نویس کو شاعری کرتے ہوئے۔“

تیسرے روز کی بات ہے ٹیلی فون کی مسلسل جتنی ہوئی ٹھنکی نے مجھے مری بند سے جگا دیا تھا۔ میں رات دو بجے اپنی آنکھوں پر کتاب ”پراسرار حکار“ کا آخری باب کھل کر کے سونے کے لئے بستر پر گیا تھا۔ میں بیدار ہوا تو مجھ پر مری غنودگی طاری تھی اور آنکھوں میں اتنی بھندیر تھی کہ پلکیں ہی نہیں کھل رہی تھیں۔ میں نے اندازے سے اپنا ہاتھ سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھایا جس پر بیڈ لیپ اور ٹیلی فون رکھے تھے۔ میرا ہاتھ بیڈ لیپ پر پڑا تو میں نے ٹیبل کر اس کا شن تلاش کیا۔ دوسرے لمحے کمرے میں ہلکی روشنی پھیل گئی۔ اس روشنی میں ’میں نے بے وقت تمام پلکیں اوپر اٹھا کر دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ میں دل میں حیران ہوا کہ اتنی رات مجھے کس کا ٹیلی فون ہو سکتا ہے۔ اس کمرے میں جو ٹیلی فون تھا وہ نشست گاہ کے ٹیلی فون سے منسلک تھا۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں ایک خیال بجلی کی طرح آیا کہ کہیں ہسپتال سے نجم التناہر کی ماں نے تو رنگ نہیں کیا؟ وہ آج رات اپنی بیٹی کے پاس رکھی گئی تھیں حالانکہ ان کے رتنے کا کوئی جواز نہیں تھا اس لئے کہ وہاں ایک نرس ڈیوٹی پر بھی تھی اور اس کے علاوہ نجم التناہر کی طبیعت تو آج بالکل ٹھیک تھی۔ وہ بڑی تیزی سے رو بہ صحت ہو رہی تھی اور پھر آج میں سارا دن اس کے کمرے میں موجود رہا تھا۔ رات نو بجے وہاں سے اٹھا تھا اس لئے کہ اس کے سونے



بھی رہ چکے ہیں بگڑ دیش بننے سے پہلے۔ وہ صرف آپ سے ملنے کے لئے موت سے لڑ رہے ہیں۔“

”ایک منٹ.....“ میں نے اس سے کہا۔ ”مجھے ذرا سوچنے دو۔“

میں سوچنے لگا کہ کیا کروں؟ اس لڑکی نے مجھے عجیب محسوس میں ڈال دیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک تکشس سی ہونے لگی۔ یہ میرے لئے بے حد عجیب بات تھی کہ ایک نوجوان لڑکی رات کے تین بجے مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ اس کا باپ بھی مجھ سے فوری طور پر ملنے کا خواہشمند تھا اور وہ زندگی اور موت کی تکشس میں مبتلا تھا۔ وہ میرا نام تھا۔ وہ میرا دوست تھا۔ معلوم نہیں یہ لڑکی کون تھی۔ اس کا والد کون تھا۔ اس کا کیا نام تھا۔ وہ میرا دوست بھی تھا۔ یہ کیسا اسرار تھا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ لڑکی کسی وجہ سے کچھ بھی بتانے کے لئے تیار نہ تھی۔

کیا مجھے اس شخص سے مل لینا چاہئے جو میرا دوست بھی ہے اور مرنے سے پہلے مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ آخر یہ شخص کس طرح سے موت کے منہ میں جا پہنچا؟..... کیسے؟..... میرے ذہن میں سوالوں کے زہریلے سانپ پھنکارنے لگے۔

میں نے بادل خواست اس سے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں..... مگر آپ سے کہاں آ کر ملوں۔“

”رستہ کارین پارک کے عقبی حصے میں.....“ وہ بولی۔ ”آپ ابھی اور اسی وقت نکل رہے ہیں نا؟“

”جی ہاں.....“ مجھے دیر بھی ہو سکتی ہے اس لئے کہ اتنی رات کو کسی سواری کا ملنا بہت مشکل ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ کا نام کیا ہے؟ اور پھر میں آپ کو کیسے پہچانوں گا؟.....؟ آپ وہاں کس جگہ پر ہوں گی؟“ میں نے ایک ہی سانس میں اس سے کئی سوال کر ڈالے۔

”میرا نام لڑکی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میرے سوا وہاں کوئی عورت تو کیا مرد بھی نہیں ہو گا۔ میں خود ہی آپ تک پہنچ جاؤں گی۔“

پھر ٹیلی فون کا سلسلہ یک نخت منقطع ہو گیا۔ میں نے ہستے سے نکل کر لائٹ آن کی اور باقی غسل خانے کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا کہ اگر میرا نامیدہ دشمن مجھے پھانسنے کے لئے میرے لئے بچا رہا ہے تو کوئی بات نہیں یہی ایک راستہ ہے اس تک پہنچنے اور اس سے مقابلہ کرنے کے۔ مجھے کبھی اپنی جان کی پروا نہیں رہی تھی اس لئے کہ موت کا ایک دن

لتی۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کا ٹیلی فون ٹیپ کیا جا رہا ہے۔ اس وقت ٹیپ شاید نہیں ہو رہا ہے اس لئے میں نے آپ کو اس وقت زحمت دی۔“

”ٹیلی فون ٹیپ ہو رہا ہے؟“ اس کی اطلاع پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ”کون ٹیپ کر رہا ہے؟“

”وہی جس نے آپ پر آپ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔“ وہ کہنے لگی۔ ”میں آپ سے فوری طور پر ملنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ ایک گھنٹے کے اندر واپس.....“ مجھ سے مل سکتے ہیں؟“

”کیا.....؟“ میں چونک پڑا۔ ”آپ مجھ سے کس لئے ملنا چاہتی ہیں.....؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ صبح سات بجے کے بعد کسی وقت یہاں تشریف لے آئیں۔“

”میں آپ کو ٹیلی فون پر بتا نہیں سکتی کہ آپ سے کس لئے فوری طور پر ملنا چاہتی ہوں۔“ اس کا لہجہ ایک دم نہ اسرار سا ہو گیا۔

”مگر محترمہ رات کا وقت ہے اور اس وقت ملنا کسی طرح مناسب بات نہ ہو گی۔“ میں نے معذرت کی۔ ”آئی ایم سوری مس!“

”اس وقت ایک ایک لمحہ میرے لئے ہی نہیں آپ کے لئے بھی کتنا قیمتی ہے اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے؟ سویرا کس نے دیکھا ہے مسٹر سالار!“ ایک لخت اس کی آواز ابھرا گئی۔ ”پلیز! اس ملاقات کو آپ صبح پر نہ ٹالیں۔ پھر اس ملاقات سے کف افسوس ملنے سوا کچھ نہ ہو گا۔ آپ ساری زندگی بچھتا رہیں گے۔“

”آپ مجھ سے کیا باتیں کر رہی ہیں۔ صاف صاف بتائی کیوں نہیں کہ اصل بات کیا ہے۔“

”یہ ایک مجبوری ہے مسٹر سالار!“ وہ دہل کر فٹ لیمے میں کہنے لگی۔ ”در اصل آپ سے ملنے کے لئے ایک اور شخص ہے جس سے آپ کو اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ وہ اس دینا سے رخصت ہونے سے پہلے آپ سے آخری بار ملنا چاہتا ہے۔“

”دیکھئے مس.....“ میں نے ترختے لیمے میں کہا۔ ”میرے خلاف کوئی چال تو نہیں بچھا یا جا رہا؟“

”جی نہیں.....“ اس کے لیمے میں ہلا کا کرب نمایاں تھا۔ ”میں آپ کو صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ بد نصیب شخص میرے والد ہیں۔ آپ کے دوست ہی نہیں ہم جماعت

پھوڑے آیا تھا۔ غیتا پڑو پر سر کے گرد کئی دوہو دونوں نشتے میں دھت تھے۔  
میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی نہیں لی تو وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی باتوں سے ایسا  
لگ رہا تھا کہ وہ بڑے بڑے انکشافات کرنا چاہتا ہے۔ میں بارہا جھٹکنے لگا کھڑی کاشیش اڑا  
ہوا تھا اور ٹھنڈی تیز ہوا اندر آ رہی تھی۔ میری آنکھوں میں ابھی تک نیند بھری ہوئی تھی  
اس لئے نیند کے جھوٹے آنے لگے تھے۔ پھر میں جیسے سوئی گیا۔  
ایک جھٹکے سے جھٹکے سے ٹیکسی رکی تو میری آنکھ کھل گئی۔ دھان منڈی کی طرف  
جانے والی سڑک کے کنارے اس نے ٹیکسی روک لی تھی۔ یہاں سناٹا تاریکی اور درانی  
چھائی ہوئی تھی۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا ہوا؟ تم نے گاڑی کیوں  
روکی؟“

”انجمن میں شاید کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔“ اس نے مجھے عقبی آئینے میں دیکھتے  
ہوئے جواب دیا۔ میں نے اس کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات کو بدلتے دیکھا۔ اس  
نے گاڑی انجمن بند نہیں کیا تھا۔ اس میں کوئی خرابی نہ ہو گئی تھی تو اسے بند ہو جانا چاہئے  
تھا۔

”انجمن میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے یا تمہاری نیت میں..... گاڑی تو ٹھیک  
ٹھاک چل رہی تھی، تم نے اسے روکایوں؟“

”آپ نے نشتے میں بھی خوب اندازہ لگایا سہرا!“ اس نے استہزا کی انداز سے ہنستے  
ہوئے بائیں ہاتھ سے وہ دروازہ کھولا جہاں میں بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلا تو میں چونک پڑا۔ اس  
کے دائیں ہاتھ میں خوفناک قسم کا چاقو کھلا ہوا تھا۔ ”سہرا! ذرا شرافت سے اپنے بڑے کا  
دیدار تو کرادیں۔“

”اچھا تو تم لیر سے بھی ہو۔“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”تمہیں ٹیکسی چلانے  
کی کیا ضرورت ہے۔ یہ دھندہ زیادہ اچھا ہے۔“

”ٹیکسی چلانے میں ایک فائدہ یہ ہے کہ آپ جیسے مرے مل جاتے ہیں۔ باتیں مت  
کریں، جلدی سے بڑھ لکالیں اور ٹیکسی سے اتر کے دو دو گیارہ ہو جائیں۔ ورنہ کل کے  
اخبارات میں آپ کی بھی خبر ہوگی۔“

”اچھا یہ لو.....“ میں نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈال کر نکالا تو اس کی آنکھیں  
حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ پھر اس کے ہاتھ سے چاقو پھوٹ کر گر پڑا۔ ”تمہیں کتنی  
گوئیوں کی ضرورت ہوگی ایک“ دو..... یا تین.....“

معین ہے اور میں نے ہمیشہ موت کو سر پر منزلاتے دیکھا تھا۔ ایک شکاری جب شکار کے لئے  
جاتا ہے تو وہ موت کی پرواہ نہیں کرتا ہے۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا  
ہے۔

میں نے اپنا ریو لو روڈ کیا سوٹ کیس سے پھل مارچ نکالی، نیچے بے آواز آیا۔ کسی کو  
چکا کر ان کی نیند خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی جاگتا ہو تا تو گاڑی کی چابی لے لیتا۔ انجمن  
الٹار کے ہاں ایک نہیں دو دو گاڑیاں تھیں۔ میں چند لمحوں کے بعد گھر سے باہر آیا تھا۔  
گلیاں اور سڑکیں ویران اور سنسان پڑی تھیں۔ رات کا حسن نکھر ہوا تھا ہوا میں  
خنکی تھی۔ گلابی جاڑے کے دن تھے۔ میں کسی سواری کی تلاش میں چوراہے کی طرف  
بڑھا۔ یہ گلشن کا علاقہ تھا۔ یہاں دن میں کسی سواری کا ملنا مشکل ہوتا تھا اس لئے کہ یہاں  
جھٹکے اور کوٹھیاں جھینڈ اور لوگوں کے پاس اپنی اپنی گاڑیاں ہوتی تھیں۔ اس لئے یہاں کسی  
قسم کی سواری نہیں ملتی تھی اور پھر رمنار گین پارک یہاں سے بہت دور تھا۔ میں نے سوچ  
رکھا تھا کہ آدھے گھنٹے کے اندر راند کوئی سواری نہیں ملی تو انجمن الٹار کے ہاں کسی کو چکا کر  
گاڑی کی چابیاں لے لوں گا۔

میں چوراہے پر پہنچا تھا کہ میں نے مخالف سمت سے ایک ٹیکسی کو تیزی سے آتے  
دیکھا۔ یہ ٹھیک اتفاق تھا یا نہیں مدد تھی۔ ٹیکسی میرے پاس آ کر رک گئی۔ میں نے کھڑکی میں  
سر ڈال کر ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔ ”رمنار پارک چلو گے؟“

”رمنار پارک!.....“ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے اوپر سے نیچے تک ایسی نظروں  
سے دیکھا جس میں نشتے میں ہوں۔ ”رمنار پارک سہرا! اس وقت آپ وہاں جا کر کیا کریں  
گے؟ پارک تو رات آٹھ بجے بند ہو جاتا ہے۔“

”تمہیں وہاں چلنا ہے یا نہیں.....“ میں نے تندہ لہجے میں کہا۔ ”نہیں چلنا ہے تو  
جاؤ، میں دوسری ٹیکسی لے لوں گا۔“

”کیوں نہیں چلوں گا سہرا! آپ جہاں کہیں، لے چلوں گا۔ رمنار پارک کیا کو میلا،  
چنا گنگ، راج شاشی، چلے بیٹھے، سہرا! مارا کام ہی آپ جیسے لوگوں کی خدمت کرنا ہے۔“ وہ  
سیدھا ہونٹا تھا اور اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر پھیل نشتہ کار دروازہ کھول دیا۔

ٹیکسی چل پڑی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟“  
”فلم سٹوڈیو سے.....“ اس نے جواب دیا۔ ”اداکارہ غیتا بوس کی گاڑی  
خراب ہو گئی تھی اور اس کے پڑو پر سر کی گاڑی میں کسی نے پتھر کر دیا تھا میں ان دونوں کو

”ہر قسم کی.....“ وہ گلدی پر بیٹھے بیٹھے میری طرف گھوم گیا۔ ”کوئی چاند کی تلاش میں نکلتا ہے تو کوئی نشہ خریدے، کوئی ہسپتال جاتا ہے تو کوئی ریلوے سٹیشن اگھٹا کی طرف۔“

تھوڑی دیر کے بعد رکشا رمتا پارک کے عقبی حصے میں جا کر رک گیا۔ میں نے اسے بیس ٹاکا دیے تو وہ خوش خوش چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں تاریکی، ٹنائے میں ڈوبے ہوئے باؤل میں کھڑا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ فضا پر ایک دیرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ میں ایک قریبی درخت کی طرف بڑھا۔ اس کے نیچے کھڑے ہو کر پارک کے اندر بھٹاک رہا تھا کہ اچانک میں نے اپنی پشت پر کسی سخت چیز کی جھپٹ محسوس کی۔

ایک تیز دھڑکنسوئی آواز نے پوچھا۔ ”کون ہیں آپ؟“

”سالار احمد.....“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ کے حکم پر حاضر ہو گیا ہوں۔“

”حکم پر نہیں درخواست پر۔“ وہ بولی۔ ”سالار انکل! میں صوبہ ہوں۔ حیرت ہے آپ نے مجھے آواز سے نہیں پہچانا.....“ اس نے میری پشت پر سے وہ سخت چیز ہٹائی۔ میں نے ہلٹ کر دیکھا تو اس کے خوبصورت ہاتھ میں پستول تھا۔

میں نے اپنی جیب سے پشٹل مارچ نکال کر اس کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کے نام تانے کے بادبو میں اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ روشنی کے ہالے میں اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کی ایک خوبصورت اور معصوم سی لڑکی تھی۔ اس کا چہرہ مانوس مانوس سا لگا۔ وہ میرے اور قریب آگئی۔ ”انکل! آپ نے مجھے ابھی بھی نہیں پہچانا..... میں مشتاق چوہدری کی بیٹی ہوں۔“

”مشتاق چوہدری؟“ میری نظروں کے سامنے کونسا سالیکالک پھر مجھے یاد آگیا۔ یہ صوبہ تھی۔ تین برس پہلے اسے آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ ان تین برسوں میں وہ یکسر بدل گئی تھی۔ ”صوبہ!“ میں نے اسے شانے سے لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”اب میں نے جنہیں پہچان لیا۔ وقت اور لڑکیاں اس قدر تیزی سے بدل جاتی ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی ہیں۔“

”انکل! جلدی سے چلئے..... ڈیڈی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے ایک سمت چل پڑی۔ چند قدم پور دھڑکنے کے جھنڈے پاس اس کی نیلے رنگ کی ٹوپو کا رنگاڑی کھڑی تھی۔ میں گاڑی میں اس کے ساتھ جا بیٹھا۔ اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ موقع بھی نہیں تھا۔ مشتاق چوہدری ہنگامہ ویش کے نامور

پھر وہ ایک دم سے بھاگا۔ اس نے مڑے بھی نہیں دیکھا۔ میں نے اگتیش کی طرف دیکھا تو اس میں چالیں نہیں لگی تھی۔ جیسی اس کا انجن ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ بند ہو گیا۔ میں نے باہر آکر زمین پر سے چاقو اٹھایا۔ قریب ہی بڑا سا تین ہول تھا اس کے چال دار ڈھکن میں سے چاقو اندر ڈال دیا پھر ٹیکسی کا نمبر نوٹ کیا تاکہ پولیس کو ایسے ریزن کے بارے میں اطلاع کر سکوں۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں دو روز کے ایک سائیکل رکشا آتا دکھائی دیا۔ اتفاق سے وہ خالی تھا۔ اسے ایک بہت ہی بوڑھا آدمی چلا رہا تھا۔ رکشا میرے پاس آکر رک گیا۔ ”کہاں جانا ہے بڑے صاحب!“ اس نے پوچھا۔

میں رکشا کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ”رمتا پاک..... جلدی چلو“ تیز تیز چلانا.....“

”رمتا پارک.....؟“ اسے جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں کوئی پاگل ہوں۔

”میں ہنگامہ زبان میں کہہ رہا ہوں فرانسیسی زبان میں نہیں.....“ میں نہ جانے کیوں چڑسا گیا تھا۔

اس نے رکشا چلانا شروع کر دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ بہت بوڑھا آدمی تھا۔ اس کا سر اور پیر تنگھے تھے۔ اس نے چار خانے کی لگی اور ایک بھورے رنگ کی قبض پن رکھی تھی۔ اس کے اوپر ایک بو سیدھ سوئٹر تھا۔ اس کی عمر ایسی نہیں تھی کہ اس عمر میں وہ رکشا چلائے۔ ہنگامہ دیش میں وہ ایک بوڑھا نہیں تھا جو رکشا چلا کر اپنی زندگی کو کھینچ رہا تھا ہر گاؤں اور ہر شہر میں ایسے ہزاروں بوڑھے تھے۔

”تم اس عمر میں بھی راتوں کی فینڈیں حرام کر کے رکشا چلاتے ہو۔“

”اس لئے کہ مجھے سات جانوں کا پیٹ پانا پڑتا ہے۔ دن میں زیادہ آمدنی نہیں ہوتی اور ہزاروں رکشاؤں کی وجہ سے سواریاں نہیں ملتی ہیں۔ یوں بھی لوگ بوڑھے کے رکشا میں بیٹھنا پسند نہیں کرتے ہیں اس لئے کہ انمیں جلدی ہوتی ہے۔“

”کیا رات میں سواریاں مل جاتی ہیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کیوں نہیں.....؟ جیسے آپ مل گئے اس طرح چارچہ سواریاں مل جاتی ہیں اور کرایہ بھی اچھا مل جاتا ہے۔“

”رات کے وقت کسی سواریاں ملتی ہیں؟“

شکاریوں میں سے ایک تھے۔ جب بھی میں اور ابو سرکار احمد شکار کے لئے خند رہن جاتے تھے وہ ساتھ ہوتے تھے۔

جب گاڑی تیز رفتاری سے دوڑنے لگی تو میں نے اس سے کہا۔ ”آپ نے مجھے ٹیلی فون پر نام بتادیا ہوتا میں سیدھے گھر پہنچ جاتا۔“

”ڈیڈی نے سختی سے منع کیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ نہیں چاہتے تھے کہ دشمن کو ان کی آمد کا پتا چلے۔“

”کون دشمن.....؟ وہ کہاں گئے ہوئے تھے؟“

”وہی دشمن جو اب تک نہ جانے کتنے شکاریوں کو اغوا کر چکا ہے اور سینکڑوں غریبوں کو اغوا کیا ہے اور کرایا ہے۔“ وہ بولی۔ ”ڈیڈی کوئی دو مہینے پہلے اسٹبر سے جاتے ہوئے راستے میں لاپتہ ہو گئے تھے۔ وہ آج صبح ہی پہنچے ہیں۔ اس حالت میں کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ زخموں سے چوڑا اور اس قدر دہشت زدہ ہیں کہ.....“ اس کی آواز بھرا مٹی اور گلے میں اٹکنے لگی تو وہ چپ ہو گئی۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے دھمکتی نکل کر اس کے دامن میں جذب ہو گئے تھے۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ”حوصلہ رکھو..... تمہارے ڈیڈی ٹھیک ہو جائیں گے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ان کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے انکل!.....“ وہ سسک پڑی۔

”یہ تم کیسے کہہ رہی ہو۔ موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ باو سی کفر ہے۔“

”ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔“ اس سے بولا میں جا رہا تھا۔ وہ بہ دقت تمام رک کر بولی۔ ”معلوم نہیں ہم گھر پہنچیں گے تو وہ زندہ بھی ملیں گے۔ بس اب آپ دعا کریں۔“

دھان منڈی میں مشتاق چوہدری کا بنگلہ تھا۔ جلد ہی ہم پہنچ گئے تھے۔ میں ان کے کمرے میں پہنچا تو بھالی نلیم ”صنوبر سے بڑی ہنسٹم اور ایک دوست ڈاکٹر زبیر احمد موجود تھے۔ میں مشتاق احمد کے پاس بستر پر بیٹھ تو ان کے زور چہرے پر زندگی سی آگئی۔ ”سالارا تم آگئے.....؟“

ان کی آواز اور ہوش خوشی سے کانپنے لگے۔ میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس پر خراشیں پڑی تھیں اور بدن پر چادر پڑی تھی۔ ”تم بہت اچھے وقت آئے۔ میں تھوڑی دیر کا ممان ہوں۔“ انہوں نے رک کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ ہرف

کی طرح جھٹھا۔

”غدا نہ کرے دوست!“ میں نے ان کے ہاتھ کی پشت دوسرے ہاتھ سے چھتہ پٹائی۔ ”باو سی کفر ہے۔“ میں نے گردن گھما کر نلیم بھالی کی طرف دیکھا۔ ”آپ انہیں ہسپتال کیوں نہیں لے گئیں۔ ہسپتال میں فوری طبی امداد سے ان کی حالت تو سنہیل جاتی۔“

نلیم بھالی نے میری بات کا جواب نہیں دیا بلکہ دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ ان کے جذبات بے قابو ہو رہے تھے اور آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ ان آنسوؤں کو چھپانے کے لئے وہ دیوار کی طرف منہ پھیر کے کھڑی ہو گئی تھیں۔

”ڈیڈی کسی قیامت پر ہسپتال جانے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ لہذا ڈاکٹروں کو گھر پر بلا کر دکھانا پڑا۔“ صنم بولی۔

”وہ کس لئے.....؟“

”اس لئے کہ..... وہ ہسپتال میں دم توڑنا نہیں چاہتے ان کی خواہش ہے کہ گھر میں ان کی زندگی.....“ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”میں گھر میں پیدا ہوا اور گھر میں رہا چاہتا ہوں۔“ وہ نقابت سے بولے۔ ”یہ وقت بحث و تکرار کا نہیں ہے۔ میرے پاس تھوڑی سی زندگی ہے میں تمہیں اس شخص کے بارے میں بہت ساری باتیں بتانا چاہتا ہوں جو انسان نہیں درندہ ہے۔“

”کون ہے وہ.....؟“ میں نے پوچھا۔ ”کہاں رہتا ہے؟ میں تمہارا اس سے انتقام لے کر رہوں گا۔“

”وہ درندہ ہے سالار لیکن دیکھنے میں مذہب انسان لگتا ہے۔“ وہ بتانے لگا۔ ”وہ کس جگہ رہتا ہے یہ میں نہیں جانتا..... وہ ایک جزیرے میں رہتا ہے۔ یہ جزیرہ کہاں ہے مجھے نہیں معلوم..... میں معجزاتی طور پر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ وہاں تو پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا ہے۔“

”کیا اس نے جزیرے پر اپنی حکومت قائم کر رکھی ہے؟“

”ہاں.....؟“ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے چہرے پر ہلاکی تکلیف نظر آنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد کہنے لگے۔ ”اس نے زبردست پہرہ لگا رکھا ہے۔ اس کے بد معاش ساتھی اور ملازم بد وقت مسلح اور چوکنارہتے ہیں۔“

”آپ وہاں سے فرار ہونے میں کس طرح کامیاب ہو گئے؟“

کرتا ہے اور ان کا گوشت کھا جاتا ہے یہ شخص کوئی جنگلی نہیں تھا۔ اس مذہب دنیا کا باشندہ تھا ایک مذہب اور تعلیم یافتہ شخص تھا اس نے میرے شکاری دوست مشتاق چوہدری کو ایک دروناک موت سے دوچار کیا تھا میں ایک شفیق انسان سے محروم ہو گیا اس کے گھر میں ایک اندھیرا چھا گیا تھا۔

میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اس درندہ خصلت انسان کو موت کے گھاٹ نہیں اتاروں گا اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا میں اس درندے کا شکار کروں گا۔ اس کا سارا جسم گولیوں سے چھلی کر دوں گا۔

☆-----☆-----☆

ایک ہفتہ گزر گیا۔ نجم النصار اپنے گھر آگئی تھی۔ اسے ڈاکٹروں نے ایک ہفتے تک مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا مگر اس نے ڈاکٹروں کی ایک نئی سی۔ وہ انور ندیم کے ساتھ مل کر میری کتاب کی رومانی کی تقریب منقہ کرنے کی تیاری میں مصروف ہو گئی دوسری طرف سے اس نے مشتاق چوہدری کی موت پر اپنے اخبار میں حکومت کی بے قوتی، عدم دلچسپی اور پولیس کی بجرانہ خاموشی پر ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ حکومت سے لے کر پولیس تک مل گئی۔ پھر سارے ملک میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور اس درندہ خصلت انسان کے خلاف جلوس بھی نکالے گئے اور حکومت نے اس شخص کے سر کی قیمت دس لاکھ ٹاکا مقرر کر دی۔

ابو سرکار احمد بھی منگوا کر لے لوٹ آئے تھے۔ انور ندیم اور میں شام کے وقت ان کے گھر چلے جاتے تھے۔ پھر میں تینوں سر جو ڈکریٹھ جاتے تھے تکی دنوں سے ہم تینوں مل کر اس انسانوں کے پراسرار شکاری کے خلاف منصوبہ بناتے رہے۔ مشتاق چوہدری کی موت نے مملکت دی ہوئی تو حمار دارا بہت آسان ہو جاتا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس جزیرے کو تلاش کریں۔ ممکن ہے یہ جزیرہ نہ ہو بلکہ رنگائی کا جھگڑ ہو۔ میری کتاب کی رومانی دالے روز سارے اخبارات میں ایک روح فرسا خبر چھپی کہ ایک اور شکاری ابو المنصور جو اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ شکار کے لئے سندھ بہن راکٹ اسٹیشن میں جا رہے تھے، وہ اپنے دو ساتھیوں سمیت پراسرار طور پر لاپتہ ہو گئے تھے۔ ایک خبر اور بھی تھی کہ ایک لالچ جو چاند پور سے بادی سال کی طرف جارہی تھی اس میں جو چالیس افراد سوار تھے وہ بھی لاپتہ ہیں جبکہ خالی لالچ بادی سال سے دس کلو میٹر دور ایک گاؤں کے پاس مل گئی ہے۔ پولیس کے ذرائع کے مطابق یہ حرکت اس درندہ خصلت شکاری کی تھی۔ ان

”یہ لمبی کہانی ہے جسے سنانے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ موت مجھے مملکت نہیں دے گی۔“ وہ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگے۔

”کس شہر کے آس پاس ہے..... چٹاگانگ، باری سال، رنگائی، کاکس بازار اور.....؟“

”میرا ذہن کچھ کام نہیں کر رہا ہے۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے جھڑا لیا۔

”میں تاریکیوں میں ڈوب رہا ہوں۔“

”اپنے آپ کو سمجھنا ہے چوہدری صاحب! آپ بالکل ٹھیک ہیں آپ کو کچھ نہیں ہوا ہے۔“

”اگلے سچ کہہ رہے ہیں ڈیڈی! صوبہ دوسری طرف آکر بہتر بیٹھ گئی۔“

”وہ غیبیت شکاریوں کا زبردست دشمن ہے..... انسانوں کا بھی دشمن ہے۔“

ان کی سانس تیز ہونے لگی۔

”وہ شکاریوں اور انسانوں کا شکار کر کے ان کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے؟“

”وہ.....“ وہ مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ”وہ ان کا گوشت..... کھاتا ہے۔“

”اس لئے وہ انسانوں کا.....“

مشتاق چوہدری کی آواز ڈوبنے لگی۔ سانس ان کا ساتھ چھوڑی تھی۔ ڈاکٹر زہیر احمد نے قریب آکر ان کی نبض دیکھی، پھر میری طرف دیکھا تو ان کے چہرے پر مایوسی کی گھٹا تھی۔

”آئی ایم سوری! اب کوئی امید نہیں رہی.....“

چند لمحوں کے بعد آخر موت نے ان کی ساتھ برس کی زندگی کو لگت دے دی اور ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تو ڈاکٹر زہیر احمد نے چادر کھینچ کر ان کے چہرے پر ڈال دی۔ پھر اس کمرے میں ایک کمراسا چھایا۔ صوبہ اور صوبہ میرے سینے سے لگ کر رونے لگیں۔ فضا میں بھلائی اور ان کی لڑکیوں کی آہیں اور سسکیاں گونجنے لگیں۔ میں اور ڈاکٹر زہیر احمد ان تینوں کو کمرے سے نکال لائے۔ نیکم بھلائیوں کھانے لگیں پھر وہ غش کھا کر بے ہوش ہو گئیں۔ وہ بیس برس کی رفاقت کے بعد اس دنیا میں الکی رہ گئی تھیں۔

میں دو تین دن ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ ایک طرف مشتاق چوہدری کی المناک موت سے میرے دل کو کمراسا درد پہنچا تھا دوسری طرف اس شقی القلب آدمی کی درندگی نے میری نفرت، غصے اور انتقامی جذبے کو اپنی انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس دھرتی پر ایک ایسا خون آشام انسان بھی موجود ہے جو انسانوں اور شکاریوں کا شکار



روک لیا۔ ان کے ہاتھ میں میری کتابیں تھیں۔ انہوں نے کتابوں پر آؤ گراف لینے کے بعد مجھے جانے کی اجازت دی۔ بھرنائی گاڑی پریس کلب کے باہر تھی یہ نئے مائل کی مرسلہ گاڑی تھی۔

میں دل میں حیران تھا کہ ایک ریٹائر فوجی افسر کے پاس اتنی قیمتی گاڑی کہاں سے آئی۔ بلکہ دیش بنے کے بعد اور فوجی حکومت کے قیام نے ان فوجیوں کی تقدیریں بدل دی تھیں۔ آج وہ کسی سرباہ دار سے کم نہیں تھے ان کے گلشن، بتائی اور دوسرے اچھے رہائشی علاقوں میں بیٹھے اور کوٹھیاں تھیں اور لاکھوں ٹاکا کی مالیت کے لوازمات سے آراستہ و پیراستہ تھیں۔

بھرنائی گاڑی بھی بتائی میں تھا۔ گاڑی خودی چلا رہی تھی۔ میں اگلی نشست پر اس کے پہلو میں بیٹھا تھا اور اس کی باتیں سن رہا تھا وہ میری ایک کتاب کا ذکر کر رہی تھی جو اسے بے حد پسند آئی تھی۔ اس سے باتیں کرتے کرتے معامیری نظر غیبی آئینے میں پڑی تو میں چونک پڑا۔ میں نے ایک جپ کو غیر محسوس انداز سے تعاقب کرتے پایا۔ بھرنائی گاڑی بڑی تیز رفتاری سے چلا رہی تھی گاڑی پوری طرح اس کے قابو میں تھی۔

میں نے اس کی باتوں کے درمیان میں پوچھا۔ ”تم کتنی تیز رفتاری سے گاڑی چلا سکتے ہو؟“

”بہت زیادہ..... میں لندن میں دو مرتبہ تیز رفتاری سے گاڑی چلانے کے مقابلے میں پہلے نمبر پر آچکی ہوں۔“

”اگر میں ابھی اور اسی وقت تمہارا امتحان لینا چاہوں تو.....؟“

”ضرور.....“

”بھرنائی اور گاڑی کی رفتار بڑھانے لگی۔“ آپ میرا امتحان کس لئے لینا چاہتے ہیں؟“

”اس لئے کہ پیچھے جو جپ آ رہی ہے وہ ہمارے تعاقب میں ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم نے انٹر پورٹ پر میرے ساتھ پیش آنے والا وہ واقعہ پڑھا ہو گا جس میں خیم انبار شدید زخمی ہو گئی تھی۔ ایک جیسکی ڈیوٹر بھی..... آج پھر یہ بد معاش مجھے کوئی شان دار استقبالیہ دینا چاہتے ہیں۔“

”وہ بھول رہے ہیں کہ آپ ایک شکاری ہیں اور میں ایک جرنیل کی بیٹی.....“ وہ بے خوفی سے بولی۔

”میں چاہتا ہوں کہ انہیں کسی سنان علاقے میں گھیرا جائے۔“ میں نے جیب سے

دو خنروں سے پورے ملک میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

میری کتاب کی رو نمائی کی تقریب ڈھاکا پریس کلب کے سبزہ زار پر منعقد ہوئی تھی۔ اس تقریب کے صدر بلکہ دیش کے مشہور ادیب، ڈرامہ نگار اور ناول نگار علاء الدین آزاد تھے جو بلکہ ادب میں اپنا زبردست مقام رکھتے تھے۔ مہمان خصوصی نڈل اکیڈمی کے ڈائریکٹر تھے۔ میری کتابیں بلکہ زبان میں ترجمہ ہو کر پہلے بھی شائع ہو چکی تھیں۔ ہر کتاب کے وہ س ڈائریکٹر پچھتے تھے اور کئی کتابوں کے ایڈیٹر زیر طبع تھے۔ میں یہاں کے لوگوں کے لئے اچھی نہیں تھا اس لئے اس تقریب میں میری توقع سے کہیں بڑھ کر لوگ جھڑک ہوئے تھے۔ یہ تقریب حد کا کامیاب رہی تھی۔ میری کتاب کے چھ سو نئے قارئین ہاتھ فروخت ہو گئے تھے۔ اس تقریب کی کامیابی پر خیم انبار کا بڑا ہاتھ تھا۔

تقریب کے اختتام پر خیم انبار اپنے گھر والوں کے ساتھ جلدی چلی گئی اس لئے کہ وہ بے حد تھک چکی تھی۔ علاء الدین آزاد نے مجھے اور خیم انبار کو دوسرے دن دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا میں نڈل اکیڈمی کے ڈائریکٹر سے باتیں کر رہا تھا کہ ایک بہت حسین اور نوجوان لڑکی میرے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ ڈائریکٹر صاحب نے مجھ سے رخصتی کی اجازت چاہی تو میں اس لڑکی طرف متوجہ ہوا۔ ”فرمائیے۔“

”میرا نام بھرنائی تھا راجہ ہے۔“ اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھایا۔ ”میرے ڈیڈی ریٹائرڈ میجر جنرل افتخار راجہ ہیں انہوں نے آج کی رات آپ کو کھانے پر مدعو کیا ہے کیا آپ غریب خانے کو روکتی نہیں گئے۔“

میں نے اس سے ہاتھ ملانے کے بعد کہا۔ ”اس عزت افزائی کا شکریہ..... کیا یہ پروگرام کسی اور دن نہیں ہو سکتا۔“

”میں کوئی دو دن سے آپ سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں آپ سے رابطہ نہ ہو سکا۔“ وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ”میرے ڈیڈی چونکہ کل کراچی ایک مینے کے لئے جا رہے ہیں اس لئے وہ آج ہی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

اس وقت انور ندیم میرے پاس آیا تو بھرنائی نے اسے سلام کیا وہ دونوں ایک دوسرے سے واقف تھے۔ میں نے بھرنائی کے والد کی دعوت کا ذکر کیا تو انور ندیم نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم ہو آؤ..... افتخار صاحب خود بھی ایک بہت اچھے شکاری ہیں۔“

میں دوستوں، سگائیوں اور مہمانوں سے مل کر بھرنائی کے ہمراہ اس کی گاڑی کی طرف بڑھتا ہوا میرے بہت سارے مہمانوں نے جن میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی میرا راستہ



بڑے ہتاک سے ملی تھیں۔ کھانے کی میز پر آج کے ایڈوکیٹر کے بارے میں بھی بڑی دیر تک باتیں ہو رہی تھیں۔

کھانا پر گفتگو اور بے حد شان دار تھا کھانے کے بعد ہم نشست گاہ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور کافی کا دور چل رہا تھا۔ افتخار احمد نے اچانک مجھ سے دریافت کیا۔ ”مسٹر سالار احمد! آپ کس نمبر کا جو تباہتے ہیں؟“

”نمبر.....“ میں نے بتایا۔ ”میں اپنے لئے جو تے آؤں روئے کرا سیکھل طور پر بنوا تا ہوں۔“

”نمبر.....“ وہ مسکرائے۔ ”اتفاق سے میرے پیر کا نام بھی نو نمبر کا ہے۔ میں آج آپ کو ایک جوتی جو تے کا تحفہ پیش کر چاہتا ہوں۔ آپ نے اپنی ساری زندگی میں کبھی ایسے چری جو تے نہیں پہنے ہوں گے جو نہ صرف بے حد نرم ملام اور آرام دہ ہیں بلکہ بڑی نفاست سے تیار کئے گئے ہیں۔ یوں تو دیکھنے میں بے حد ہلکے پھلکے اور نازک سے لگتے ہیں لیکن ہیں بے حد مضبوط..... خوبصورت اس قدر ہیں کہ آدمی دیکھتا رہ جاتے۔“

اس سے پہلے کہ میں اپنی طرف سے کچھ کتاوہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”جھربا بیٹی! جو تے کا وہ ڈبے لے آؤ جو الماری میں رکھا ہوا ہے۔“ جھربا جو تے لینے کے لئے نشست گاہ سے نکل گئی۔ افتخار احمد نے جوتوں کی اس قدر تعریف کی تھی انہیں دیکھنے کے لئے میرا اشتیاق اور دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ چند لمحوں کے بعد جھربا جوتوں کی جوڑی لے آئی جو ایک خوبصورت ڈبے میں پیک کے ہوئے رکھے تھے۔

افتخار احمد نے ڈبے میں سے جوتے نکال کر میرے سامنے رکھے تو میں ان جوتوں کو دیکھا رہ گیا تھا انہوں نے غلط نہیں کہا تھا میں نے اپنی زندگی میں واقعی اتنے خوبصورت جوتے پہارے اور بے حد مضبوط جوتے نہیں دیکھے تھے۔ ان کی بناوٹ میں ایسا حسن تھا کہ میں عیش عشق کر رہا تھا۔ یہ سیاہ رنگ کے تھے سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان پر کوئی پالش وغیرہ نہ تھی۔ بغیر پالش کے وہ اپنی آب و تاب دکھا رہے تھے۔

”آپ ذرا انہیں پہن کر تو دیکھئے؟“ افتخار احمد بولے۔ ”آپ کے سائز کا بھی ہے یا نہیں.....“

میں نے انہیں پہنا تو سارے بدن میں ایک عجیب سی فرحت دوڑ گئی۔ اس میں ذرہ برابر بھی خشک نہیں تھا کہ یہ بے حد آرام دہ ملام اور مضبوط بھی تھے۔ میرے پیر میں بالکل

ریو اور نکالنے ہوئے کہا۔ ”جیب میں وہی دو بد معاش نظر آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک بد معاش بھی ہاتھ لگ گیا تو ہم بڑی آسانی سے ان کے سرخونہ تک پہنچ سکتے ہیں۔“

”میں آپ کی بات سمجھ گئی۔ آپ ذرا سنبھل کر بیٹھ جائیں۔“ اس نے رفتار اور بڑھاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

”رفتار غیر محسوس انداز سے تیز کرتی جانا۔ انہیں ذرا بھی احساس نہ ہو کہ ہمیں ان کے تعاقب کا احساس ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔

جھربا بہت تیز ذہن اور سمجھ دار لڑکی تھی۔ اس نے میری بات پر پوری طرح عمل کیا۔ اس نے دھان منڈی کا ملا تہ پار کرنے کے بعد گاڑی کو گلشن کے راستے پر ڈال دیا۔ ہمیں وہیں سے گزرنا بھی تھا۔ اس نے ایک سنان راستے پر گاڑی لا کر اس کی رفتار دھیمی کر دی تاکہ جیب پر آجے اور میں ان کی گاڑی کو اپنے نشانے کی زد میں لوں۔ ان بد معاشوں کا خیال تھا کہ میں مسلح نہیں ہوں۔ ان کی گاڑی جب ہماری گاڑی سے ایک گز پیچھے تھی میں نے اپنا ہاتھ ٹکڑی سے باہر نکال کر جیب کے پینے کا نشانہ لیا پے درپے دو فائر کئے جو اپنے نشانہ پر جا کر لگے ان کی جیب کچے راستے میں اتر گئی اور بے قابو ہو گئی۔ میرے کہنے پر پھرتانے گاڑی ایک طرف روک لی۔ اس لئے کہ جیب ایک درخت کے پاس رک گئی تھی۔

جیب جہاں رکی تھی وہاں اندھیرا تھا۔ اس کی ہیڈ لائٹس انہوں نے آف کر دی تھیں۔ میں نے اس طرف فائر کیا لیکن ادھر سے جوابی فائر نہیں ہوا البتہ میں نے ان کے بھاگنے کی آواز سنی۔ وہ میرے مسلح ہونے کے خوف سے بھاگ نکلے تھے۔ ادھر چاروں طرف گپ اندھیرا تھا میں جیب کی طرف بڑھنے لگا تو جھربا بولی۔ ”مسٹر سالار! ذرا احتیاط سے.....“

میں جیب کے پاس پہنچا وہ دونوں بد معاش اندھیرے میں گم ہو چکے تھے اور ان کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے جیب سے پشیل نارنج نکال کر جیب کے اندر اس کی روشنی ڈالی! جیب میں ایسی کوئی چیز نہیں لی جو میرے کسی کام آئے یہ جیب چوری کی لگتی تھی۔ یہ بد معاش دروازوں میں چوری کی گاڑیاں استعمال کرتے تھے۔

میں جھربا کے ہاں پہنچا تو اس کے والد افتخار احمد نے میرا بڑی گر خوشی سے استقبال کیا کھانا لگنے تک ہم دونوں آپس میں شکار کے موضوع پر بڑی دتک باتیں کرتے رہے تھے۔ میز پر کھانا پھنے کے بعد عظیم مسلط افتخار ہمیں کھانے کی میز پر لے جانے کے لئے آئیں وہ بھی

دیتے ہیں۔“

”سات ہزار ٹاکا..... ہر کوئی اسے خرید نہیں سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کا یہ عظیم تحفہ میں بھی اپنے سے جدا نہیں کروں گا۔ یہ مجھے بیشاپ آپ لوگوں کی یاد دلانا رہے گا ایک باہر چراس تحفے کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔“

”اس بری شخص نے مجھے بتایا کہ یہ جوتے یورپ اور امریکہ میں پانچ چھ ہزار ڈالر میں فروخت ہوتے ہیں اور پھر یہ جوتے ایک عام شخص کی قوت خرید سے باہر ہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی یہ سارے جوتے ایک ہی دن میں فروخت ہو جاتے ہیں۔“

باپ اور بیٹی میرے گھر مجھے چھوڑ گئے تھے۔ واپسی میں کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ وہ جیپ البتہ وہاں نظر نہیں آئی شاید وہ بد معاش اسے وہاں سے لے گئے تھے۔ اب مجھے پہلے سے زیادہ چوکنا اور ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی۔

میں نے یہ انمول تحفہ نجم النصار اور اس کے گھروالوں کو بھی دکھایا۔ نجم النصار نے ان جوتوں کے بارے میں سا ضرور تھا لیکن اسے ابھی تک انہیں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ان سب نے جوتوں کو اس طرح حیرت سے دیکھا تھا جیسے وہ دنیا کا کوئی عجوبہ دیکھ رہے ہوں۔ یہ جوتے واقعی کسی عجوبے سے کم نہیں تھے۔ میں انہیں رات گئے تک حیرت سے الٹ پلٹ کر اور بہن کر دیکھتا رہا تھا۔ میں نے انور ندیم اور ابو سرکار احمد کو دوسرے دن یہ جوتے دکھائے تھے۔ اتفاق سے ابو سرکار احمد کے پاس اس کی ایک جوڑی تھی جو سفید رنگ کی تھی۔

میرے اور ابو سرکار احمد کے درمیان اس ہزار ہشکاری کی تلاش میں نکلنے کے لئے ایک منصوبہ طے پایا۔ اس مہم کو سر کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ میں راکٹ اسٹیر سے سندر بن شکار کھیلنے جانے کے لئے کھانا روانہ ہوں۔ میرے کھانا روانگی اور شکار کے لئے جانے کی خبر تمام اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہو۔ اس خبر کو پڑھ کر وہ انسانوں کا ہزار ہشکاری مجھے اغوا کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں سفر کے دوران وہ ہوشیار اور چوکنا رہوں۔ کسی نہ کسی طرح کوشش کر کے اس گروہ کے ایک آدمی کو قاپو میں کر لوں۔

تیسرے روز منصوبہ کے مطابق ڈھاکا شہر کے تمام اخبارات میں میری کھانا روانگی اور سندر بن کے جنگل میں شکار کھیلنے کی خبر نمایاں طور پر چھپ گئی۔ میں اس مہم پر روانہ ہو رہا تھا تو سب سے زیادہ اس نجم النصار تھی۔ بے حد فکر مند تھی اور رخصت کرتے وقت رو پڑی تھی۔ میں اسے دلاسا دے کر ناراض گنج چلا گیا۔ انور ندیم اور ابو سرکار احمد مجھے

فٹ آرہے تھے ان کے گدازے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرے پیروں کے نیچے ریٹم ہو۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ میں نے جوتے پیک کر کے ڈبے میں رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ جوتے کیا یہاں تیار ہوئے ہیں؟“

”اس میں شکریہ کی کیا بات ہے مہتر سالار! وہ بولے۔“ یہ جوتے یہاں تیار نہیں ہوئے بلکہ سال میں دو مرتبہ ایک بری بڑا شخص ان جوتوں کو لے کر فروخت کرنے آتا ہے وہ جوتوں کی سو ڈیڑھ سو جوتوں کے آتا ہے اس کے مخصوص گاہک ہیں وہ ان کے ہاتھ فروخت کر کے چلا جاتا ہے۔ صدر مملکت بھی اس سے جوتوں کی دو ایک جوڑی خریدتے ہیں۔“

”کتنے رنگ ہوتے ہیں ان جوتوں کے.....“ میں نے دلچسپی ظاہر کی۔ ”اس کالے رنگ میں بھی کتنا حسن اور چمک ہے کتنی کشش ہے۔“

”اس کے پاس دو تین رنگ ہوتے ہیں۔“ وہ بتانے لگے۔ ”یہ رنگ بھی انسانی جلد کی طرح سانو لے ہمرے سانو لے، سرخ و سفید اور بے حد سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں ہر رنگ اپنے اندر بڑی جاذبیت اور کشش رکھتا ہے۔“

یہ کس جانور کے چمڑے کے ہوتے ہیں؟

”اس نے بتایا کہ برما کے جنگلوں میں ایک جانور پایا جاتا ہے اس کا نام ٹوی ہے یہ اس کی کھال سے بنتے ہیں۔ یہ جانور بہت کم پایا جاتا ہے یہ جانور سنا ہے نہ صرف بے حد خطرناک ہوتا ہے بلکہ ذہن بھی اسے پکڑنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔“

”پھر تو یہ جوتے بہت سستے ہوتے ہوں گے.....؟“ میری زبان سے بلا ارادہ نکل گیا۔

”جی ہاں.....“ وہ زیر لب مسکرائے۔ ”ایک جوڑی جوتے سات ہزار ٹاکا کے ہوتے ہیں۔“

میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ”سات ہزار ٹاکا.....؟ کیا اس کی قیمت بہت زیادہ نہیں ہے؟“

”بہت زیادہ تو ہے لیکن اپنی خوبصورتی اور خصوصیت کے لحاظ سے زیادہ قیمت نہیں ہے۔ اس میں ایک خاص بات اور ہے وہ یہ کہ اس پر پائلش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ یہ پائسلک اور بڑے جوتوں کی طرح ہوتے ہیں انہیں آپ کسی بھی ایجنے یا معمولی صابن سے دھوئیں ان کی چمک بڑھ جاتی ہے اور یہ بالکل نئے دکھائی

الوداع کہنے گھاٹ تک آئے تھے۔ اب سرکار احمد دوسرے دن بذریعہ طیارہ کھانا پہنچ رہے تھے۔ کھانا کے ایک ہوٹل میں کمرے بک کر لئے گئے تھے۔

میں نے فرسٹ کلاس اور ایئر کنڈیشنڈ کاکٹ ایئر تھا۔ اسٹیئر روانہ ہوا تو میں نے فرسٹ کلاس کے مسافروں میں کوئی مشتبہ مسافر نہیں دیکھا۔ زیادہ تر حسین اور جوان جوڑے ہی سفر کر رہے تھے۔ مردوں میں میرے سوا ایسا کوئی نہیں تھا جو بغیر اپنی بیوی کے ہو۔ البتہ ایک عورت بیکم جمال جو پوری اکیلی سفر کر رہی تھی۔ یہ عورت ایک جوت مل کے نیچر کی بیوی تھی۔ بلاشبہ یہ عورت حسین، طرح دار اور پیریدہ پرکشش تھی۔ جس کھ اور لٹسار طبیعت کی تھی۔ اسے مطالعے کا بڑا چکا تھا کوئی نئی کتاب اس کے ہاتھ سے بچتی نہیں تھی۔ وہ کہیں نمبر بندہ میں تھی جبکہ میرے کہیں کا نمبر تیرہ تھا۔

اس نے مجھے لچ کے وقت ڈانٹنگ ہال میں اکیلا بیٹھا ہوا پایا تو پچان لیا۔ کتاب کی رونمائی کی رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ ساتھ میں میری تصویر بھی چھپی تھی۔ پھر وہ میری میز پر آئی تھی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ لچ کھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی شادی محبت کا نتیجہ ہے۔ شادی سے پہلے وہ اس کا شو ہر لندن میں زیر تعلیم تھے۔ ان کی شادی کو دس برس ہو چکے تھے۔ اس کے دو بچے تھے جو لندن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

میاں بیوی ہر تین مہینے میں اپنے بچوں کو دیکھ آتے تھے۔

بیکم جمال کی رفاقت نے میرے سفر کا لطف دو بلا کر دیا تھا تاہم میں اپنی جگہ چوکناس اور بے حد ہوشیار تھا۔ بیکم جمال کے شاید علم میں نہیں تھا کہ اسٹیئر کے سفر کے دوران شکاری پراسرار طور غائب ہو جاتے ہیں اور آج میرے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش آسکتا ہے۔ اگر اس کے علم میں ایسا کوئی واقعہ تھا تو اس نے اس موضوع پر بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

صبح سے شام تک ہم اپنے اپنے کہیں میں بند ہونے کے بجائے عرش پر آرام وہ کرسیوں پر بیٹھے چائے پیے اور باتیں کرتے رہے تھے۔ اس نے میری نئی کتاب ایک ہی دن میں پڑھ ڈالی تھی اور اسے بے حد پسند آئی تھی۔ اس نے میری کتاب اور میری اتنی تعریف کی تھی کہ نیم النہار ساتھ ہوتی تو جمل کر اسے دریا میں دھکا دے دیتی۔ میں نے اس کی باتوں، دزدیدہ نظروں اور حد سے زیادہ بے تکلفی کو محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ پر زبردستی فدا ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ یوں بھی مجھے اس کے خطرناک حسن سے خوف آنے لگا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی نیم النہار کے سوا کسی اور عورت کے بارے میں سوچا بھی

نہیں تھا۔ یوں بھی میں ایک چالیس برس کا محض خناب میرے لئے نیم النہار کے سوا کوئی لڑکی یا عورت کشش نہیں رکھتی تھی۔ اس کا میری ذات میں حد سے زیادہ دلچسپی لینا اور متاثر ہونا پسند نہیں آیا تھا۔

دن ڈوبنے کا نظارہ دیکھنے کے بعد وہ اپنے کہیں میں چلی گئی اور رات آٹھ بجے اس نے رات کے کھانے کے لئے ڈانٹنگ ہال میں ملنے کا وعدہ کر لیا۔ میں ٹھیک آٹھ بجے ڈانٹنگ ہال میں ایک کونے کی میز پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد وہ ڈانٹنگ ہال میں داخل ہوئی تو مرد اور عورتیں اور لڑکیاں اس کو دیکھنے لگیں۔ وہ اس قدر جج و جج کر آئی تھی کہ اس کا حسن بے حد خطرناک ہو گیا تھا۔ اس کی حشر سامانیاں اس قدر واضح تھیں کہ آنکھیں اس کے چہرے اور سراپا پر ٹھہر نہیں پاری تھیں۔ اس نے قیمتی زیورات بھی پہن رکھے تھے۔ آخر وہ ایک امیر کبیر آدمی کی بیوی تھی۔ وہ اپنے لباس، زیور اور شخصیت کی کیوں نہ نمائش کرتی۔

ہم دونوں رات کا کھانا کھا کر آئے تو دس بج رہے تھے۔ ہم نے کھانا مک کھایا، باتیں زیادہ کی تھیں۔ ہم دونوں اپنے کہیں کی راہ داری میں اپنے کہیں کے سامنے ریٹک کے پاس کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تھے مگر میں چونکا تھا اور میری جیب میں بھرا ہوا روپو اور موجود تھا۔ کوئی بھی مشتبہ آدمی نظر آتا تو میں اسے بخشتا نہیں۔ ریٹک کے پاس صرف ہم دونوں ہی کھڑے باتیں نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ اور بھی جوڑے تھے۔ باہر تاریکی تھی اور سرد ہوا اچلی رہی تھی۔ راکٹ اسٹیئر تیزی سے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔

اس نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”اچھا سفر سالار! ایک بات تو بتائیں۔ اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ ہمارے اس دہس میں ایک پراسرار جزیرہ موجود ہے جس کا وجود کوکوشش کے پتا چلا یا نہیں جاسکتا۔“

”میں نے بھی بس آپ ہی کی طرح سنایا سنا ہے۔“ میں بولا۔ ”اگر اس پراسرار جزیرہ کا وجود ہو تا تو اس کا نام تو ضرور ہوتا۔“

”جزیرہ کا نام تو نہیں معلوم لیکن اس کے بارے میں بہت ساری عجیب و غریب اور پراسرار کہانیاں مشہور ہیں۔ ان کہانیوں کو سن کر مجھے بہت خوف آتا ہے۔“

”ہم لوگوں میں یہی ایک سب سے بڑی خرابی ہے کہ ذرا ذرا سی بات کو افسانہ بنا دیتے ہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن اس بات سے آپ انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ اسٹیئر کا سفر شکاریوں کے لئے بڑا

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ اس نے تکرار کی۔ ”کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال سے زیادہ دلچسپ کھیل نہیں ہے۔“

”یہ دنیا کا سب سے شاندار، سنسنی خیز اور بدبے خطرناک کھیل ہے۔ اس کھیل کے آگے دوسرے کھیل کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تو فضا پر چھائی اداسی مٹ گئی۔ ”یہ کھیل صرف شکاری کے لئے شاندار ہو سکتا ہے شکار کے لئے نہیں۔“

”میرے خیال میں ہم فصولِ باتوں میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔“ میں نے ایک لمحے کے لئے اسے نظر بھر کے دیکھا۔ اس کا حسن بھی رات کے حسن کے ساتھ ساتھ کھرتا جا رہا تھا۔ ”بیگم بھال! میں آپ سے ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ حقیقت پسندی سے سوچیں اور دیکھیں تو آپ کو احساس ہو گا کہ اس دنیا میں صرف دو طبقے ہوتے ہیں۔ ایک شکاری اور دوسرا شکار..... میری یہ خوشی قسمتی ہے کہ میں ایک شکاری ہوں۔ اگر اس درندہ خصلت پراسرار شکاری سے میرا آمناسامنا ہو تو وہ میرے ہاتھوں سے کبھی بچ نہیں سکے گا۔“

”میرا بس چلے تو میں اس خبیث بھینڑیے کو ڈھا کا شر کے بیچ جو راہ پر پھانسی دے دوں۔“ اس کا چہرہ تھمٹا لیا۔

”آپ کو وہ جزیرہ اب بھی نظر آ رہا ہے جو تھوڑی دیر پہلے آپ کو تاریکی میں نظر آ رہا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

اس نے اس سمت دیکھا جہاں اسے جزیرہ نظر آیا تھا۔ ”شاید وہ جزیرہ پیچھے رہ گیا ہے اب نظر نہیں آ رہا ہے۔“ اس نے گمراہی سے کہا۔

”میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ وہ جزیرہ دیکھ کر کچھ پریشان اور خوفزدہ سی ہو گئی تھیں۔“

”صرف میں ہی نہیں سارے لوگ اس جزیرے کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس جہاز کا کپتان، عملہ اور کینیٹن کے ملازمین تک..... اس لئے اس کو اس درندہ خصلت شخص کی حکومت اس جزیرے پر ہو گی۔ سفر کے دوران جو لوگ غائب ہو جاتے ہیں وہ یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ کتنے دکھ اور رنجرت کی بات ہے کہ حکومت نے آج تک کوئی ایکشن نہیں لیا۔ اس جزیرے پر جا کر لوگوں کے خدشات دور نہیں کئے۔“

”بات یہ ہے کہ جزیرہ ایسی جگہ ہے کہ یہاں انسان تو انسان جانور بھی رہتا پسند نہیں

خطرناک حمایت ہو رہا ہے۔ دو سال کے عرصے میں جتنے شکاریوں نے اسٹیئر سے سفر کیا وہ پراسرار طور پر لاپتہ ہو گئے۔ اب تو سنا ہے کہ شکاری اسٹیئر سے سفر کرتے ہوئے بہت ٹھہراتے ہیں۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں.....“ میں مسکرایا۔ ”اگر اس بات میں کسی قسم کی سچائی ہوتی تو میں بھی اسٹیئر سے سفر نہیں کرتا۔“

”میرے خیال میں ان شکاریوں کے ساتھ کچھ اور واقعات پیش آئے لیکن حکومت نے ان کی گمشدگی کو کچھ اور رگ دے دیا۔“

”اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“ میں نے اس کی تائید کی۔ ”حکومت کو ایسی باتوں پر پردہ ڈالنا خوب آتا ہے۔“

”آپ کو پھرب کی سمت اندھیرے میں بہت دور ایک جزیرہ سادکھائی دے رہا ہے۔“ اس نے انگلی سے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ ”دیکھیے.....“

”مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔“ میں نے اس سمت اندھیرے میں گھورتے ہوئے کہا۔

”آپ نے شام کے وقت چائے پیتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ شکاری کی نظریں بہت تیز ہوتی ہیں وہ چارچوہ سوز گرد و جھاڑیوں میں چھپے ہوئے چوہوں کو دیکھ لیتی ہیں۔ اب آپ چارباغ میل کے فاصلے پر واقع جزیرے کو نہیں دیکھ پا رہے۔“

”آپ کی خوبصورت آنکھیں غیر معمولی طور پر بہت تیز ہیں اور پھر میں ایک چالیس سالہ آدمی ہوں۔“ میں مسکرایا۔ ”میں اب رات کے وقت زیادہ دور کی چیز دیکھ نہیں پاتا۔“

”شکار تو آپ دن میں کھیلتے ہیں نا..... وہ کہنے لگی۔ ”میں نے سنا ہے کہ سندھ

بن کا جنگل گھپ اندھیرے میں ڈوبتا ہے۔“

”جنگل، جنگل ہو تا ہے اور جنگل میں اندھیرا تو ہو گا۔ ویسے وہاں شکار کھیلنے میں لطف آتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”لوگ کہتے ہیں کہ یہ کھیل بہادر اور حوصلہ مند لوگوں کے لئے ہے۔ آپ کو زیادہ لطف کیا شکار کے کھیل میں آتا ہے۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”آپ اس بات کو تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ ایک ایسا کھیل جس کا کوئی ثانی نہیں۔“

”ایسا کہیں وجہ سے محسوس ہوا ہو گا یا پھر نفعیاتی طور پر آپ نے محسوس کیا ہو گا۔ نچلے طبقے میں تو ہم پرستی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک ملاح کی تو ہم پرستی پورے جہاز کو خوف میں مبتلا کر سکتی ہے لہذا آپ نہ تو ان سے باتیں کیا کریں اور نہ ان کی باتیں سنا کریں۔“

”ممکن ہے آپ سچ کہہ رہے ہوں۔“ وہ کہنے لگی۔ ”میں نے ایک انگریزی ناول میں ایک جگہ ملاحوں کے بارے میں پڑھا تھا کہ بعض اوقات ان کی جھنپی جس بہت تیز ہو جاتی ہے جو انہیں پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کر دیتی ہے اور پھر یہ بات مسلم ہے کہ بدی بھی آواز اور روشنی کی طرح لہروں میں سفر کرتی ہے۔ اگر ایک بری جگہ سے کوئی برائی کی لہر اٹھتی ہے تو وہ سینکڑوں میل تک سفر کرتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح سے جن لوگوں کی جھنپی جس بہت تیز ہوتی ہے وہ ان لہروں کو فوری طور پر محسوس کر لیتے ہیں اس لئے ایک ملاح کی باتوں کو تو ہم پرستی کا نہیں نام دے سکتے ہیں۔“

میں نے راہ داری کا جائزہ لیا۔ ہم دونوں کے سوا یہاں کوئی نہیں تھا۔ راہ داری خالی پڑی تھی اور خاموش فضا چھائی ہوئی تھی اور لہروں کا شور گونج رہا تھا۔ کسی کا نام دہشتان نہیں تھا۔ میں نے اپنی دستی گھڑی میں وقت دیکھا تو گیارہ بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ آسمان کے افق پر نظرس جمائے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

”اب وہ محسوس جزیرہ بہت پیچھے رہ گیا ہے۔“ میں نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

”اب چل کر سونا چاہئے۔ چلے۔“

”او۔ کے بائی۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ساڑھی کا پلورہ دست کیا۔ ”صبح ناشتے کی میز پر ملاقات ہو گی شب بخیر۔“

پھر وہ اپنے کیمین کی طرف بڑی۔ اس کی چال میں بڑی دلکشی تھی۔ وہ سراپا قیامت تھی۔ اس کا سن بلا جیر تھا۔ ضدی نظرس تھیں کہ اسے دیکھتے بغیر مان نہیں رہی تھیں۔

اس نے اپنے کیمین کے پاس پہنچ کر اپنے بریس میں سے چابی نکالی۔ دروازہ کھول کر اندر جانے سے پہلے اس نے مجھے مخمور نگاہوں سے دیکھا۔ پھر دل فریب انداز سے مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میرے دل پر قیامت ڈھائی۔ جانے کیا ہونے والا تھا۔

میں اپنے کیمین میں داخل ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ ابھی تک وہ دواقدہ پیش نہیں آیا تھا جس سے کئی شکاری موت کے منہ میں چلے گئے تھے تو آج تک ان کا نام دہشتان نہیں ملا تھا اور نہ ہی اس کے کوئی آثار دکھائی دے رہے تھے۔ میں اپنی جگہ پر دی طرح مستعد اور

کریں گے۔ جس جزیرے کی آپ کی بات کر رہی ہیں میں نے اسے دن میں دیکھا ہے۔ یہ ایک غیر آباد اور خوفناک قسم کا جزیرہ ہے۔ اگر یہ کسی لائق ہوتا تو یہاں انسان اب تک آباد ہو چکے ہوتے۔“

”آپ نے ایک بات خاص طور نوٹ کی ہو گی کہ شام ہوتی ہی جہاز کے ملاح، کپتان اور دوسرے ملازمین بہت خوفزدہ نظر آگئے تھے۔ جب اسٹیمر اس جزیرے کے قریب سے گزر رہا ہے تو ان سب کا دہشت سے برا حال ہو جاتا ہے۔“

”ہاں! یہ بات میں نے بھی محسوس کی تھی۔ میں نے کپتان کبیر احمد اور اس کے ماتحت ڈیشان کو بدحواس پایا تھا۔“

”کپتان کبیر احمد کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ ایک بہادر اور مدبر شخص ہیں اگر انہیں دشمنوں کے گزرنے میں جا کر لڑنے کے لئے کہا جائے تو انکار نہیں کریں گے۔ میں نے آج انہیں بھی پریشان پایا۔ ان کی آنکھوں سے ایک خوف سا جھانک رہا تھا۔ میں نے ان سے بہت کرید اور اس جزیرے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے صرف اتنا کہا کہ..... یہ پراسرار جگہ بہت بدنام ہے، صرف مسافر ہی نہیں ملاح بھی بہت خوف کھاتے ہیں۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا آپ کو کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا؟ میں نے کہا نہیں..... اگر خوف ہوتا تو میں اکیلی سفر نہ کرتی۔ ہوائی جہاز سے چلی جاتی۔“

”آپ نے ہوائی جہاز سے سفر کیا نہیں کیا جبکہ آپ ایک گھنٹے میں کھانا پہنچ جاتیں۔“

”اس لئے کہ مجھے ہوائی جہاز کے سفر سے خوف آتا ہے اور ریل اور بس سے سفر کرنے میں آگاہت اور اذیت محسوس ہوتی ہے۔ اسٹیمر کا سفر مجھے زیادہ آرام دہ اور اچھا لگتا ہے۔“

”آپ کا اسٹیمر اور اکیلے سفر سے اجتناب کرنا چاہئے۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”میں آپ کو ایک بات ڈاؤں۔“ وہ ساڑھی کا پلورہ ہاتھ پر درست کرنے لگی۔ ”میں کوئی دین تین مرتبہ اکیلی سفر کر چکی ہوں، ڈھاکا اور کھانا۔ پچھلی مرتبہ جب اسٹیمر جزیرے کے قریب سے گزر رہا تھا تب میں نے اپنے بدن کے ایک ایک حصے میں برفانی ہوا کی سی لہر کی جھجکری طرح اترتی ہوئی محسوس کی تھی۔ اس روز گری تھی۔ جس تھا۔ ہوا بالکل بند تھی۔ مجھ پر دہشت کا حملہ ہو گیا اور میں کانپنے لگی۔ ایک ملاح نے بھی اپنی اس کیفیت کا مجھ سے ذکر کیا تھا۔“



ہیکر نے لے لی اور غم النہار کا تصور دھندلا ہوتے ہوئے ایک دم سے مٹ گیا۔ اس کے  
 پر شکوہ سراپا کی قیامتیں مجھے کسی زہریلی ناگن کی طرح ڈسنے لگی تھیں اس کے حسین چہرے  
 پر ایک دل خرب سی دکھ تھی اور گردن اوپر ہونوں پر دکھل مسکراہٹ رقصاں تھی۔ مجھ سے  
 جیسے پوچھ رہی تھی..... کیا میں تمہاری غم النہار سے کہیں زیادہ حسین نہیں ہوں؟  
 میں نے فوراً ہی اس کے تصور کو ذہن سے جھٹک دیا۔ میرے دل کے نانا خانے میں جو  
 فریم تھا اس میں صرف ایک ہی تصویر آویزاں ہو سکتی تھی۔ وہاں غم النہار کی تصویر  
 آویزاں تھی اور پھر بیگم جمال ایک شادی شدہ عورت تھی۔ میں نے اسے صرف ایک  
 دوست جانا تھا۔ اس کا خیال آنا میرے لیے حیرت انگیز تھا اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ  
 بہت حسین، پُر شباب اور غیر معمولی طور پر پُر کشش تھی مگر میرے نزدیک کسی غیر عورت  
 کے بارے میں سوچنا گناہ سے کم نہیں تھا۔

تو وہی در کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مجھ پر آہستہ آہستہ نیند کا غلبہ ہو رہا ہے وہ  
 مجھے اپنی آغوش میں لینے کے لئے بے تاب ہو رہی ہے اور اپنی مرمریں دگدگا بنا نہیں پھیلا  
 رہی ہے۔ پھر مجھے نیند کے جھوکے آنے لگے جیسے مجھ پر کسی پرانی شراب کا نشہ اثر کر رہا  
 ہو۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ سونا میرے حق میں کسی بھی طرح اچھا نہیں تھا مگر نیند تھی کہ  
 میرا شکار کرنے پر تلی ہوئی تھی اس شکاری سے مقابلہ کرنا میرے بس سے باہر ہوتا جا رہا تھا  
 آخر میں اس کا شکار ہو گیا۔ میری آنکھ کھلی کیسے لگی مجھے خبر نہ ہو سکی۔

میں نے نیند کے عالم میں سنا کہ کوئی میرا مٹا لے کر پکار رہا ہے اور دروازے پر  
 مسلسل دستک دے رہا ہے۔ میں نے بیدار ہوتے ہی دروازے کی طرف دیکھا میرے  
 کبین کے دروازے پر مسلسل دستک ہو رہی تھی آہستہ آہستہ مگر کسی کے پکارنے کی آواز  
 سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں ایک دم سے اچھل کر بستر سے اتر آیا ایک سردی لہر میری  
 ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔ میں نے ایک بل صانع کے بغیر جب سے ریوالبورنگال لیا میرا  
 دشمن پراسرار شکاری میرا شکار کرنے کی غرض سے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے  
 ریوالبور پر گرفت مضبوط کر لی اور دروازے کی طرف بڑھا قریب پہنچ کر کان لگا دیئے دستک  
 تھی کہ بند ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

میں کڑخت لہجے میں بولا تو میری آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ ”کون ہے  
 ؟“

”میں..... میں ہوں مسٹر سالار! جلدی سے دروازہ کھولے.....“ بیگم

ہو شیار تھا جب میں بھرا ہوا ریوالبور اٹھ کر ناپید ہو دشمن کے انتظار میں تھا میرے کان باہر کی  
 طرف لگے ہوئے تھے اور کسی آہٹ کے منتظر تھے وقت آہستہ آہستہ ریگ رہا تھا۔  
 اس اندیشے کا کوئی جواز نہیں تھا کہ وہ نہیں آئے گا میں جانتا تھا کہ وہ آئے گا ضرور  
 آئے گا اب تک اس لئے نہیں آیا تھا کہ وہ بھی شکاری تھا۔ ایک اچھا اور ماہر شکاری، شکار  
 کرنے میں جلد بازی اور جھلک کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ میں بھی ایک شکاری تھا اور شکاریوں  
 کی فطرت کو خوب سمجھتا تھا۔ آج ایک شکاری کا دوسرے شکاری سے مقابلہ تھا۔ دونوں  
 شکاری ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔

☆-----☆-----☆

کوئی ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ابھی تک وہ شکاری مجھے شکار کرنے کے لئے نہیں نکلا تھا۔  
 میری نگاہیں بے ستورہ دروازے پر مرکوز تھیں۔ باہر ہر طرف گمراہانا طاری تھا انجمن چلنے کی  
 آواز نغماتیں گونگ ہوتی تھی اور اس میں لہروں کا شور دھنم ہو رہا تھا۔ میں بستر پر نیم دراز تھا  
 میری نظروں میں غم النہار کا چہرہ لہرائے لگا۔ غم النہار جو میرے دل کے کسی گوشے میں  
 اس روز نے چھپی بیٹھی تھی جب سے اسے دیکھا تھا۔ میرے دل میں اس سے شادی کا  
 خیال اس لئے نہیں آیا تھا کہ میں ایک شکاری بن گیا تھا شکاری کی زندگی ایک سیلاب کی طرح  
 ہوتی ہے اس وقت میرے دل میں غم النہار کے لئے اتنی شدید محبت نہ تھی۔ مجھے عورت  
 اور اس کے حسن و شباب سے زیادہ شکار میں دلچسپی تھی۔ میری زندگی میں کوئی عورت  
 نہیں آئی تھی۔ میں چاہتا تو میری زندگی میں ایک نہیں نہ جانے کتنی لڑکیاں اور عورتیں  
 داخل ہوتی اور پہلی جاتیں۔ میری کمزوری عورت نہیں شکار تھا۔ میں اپنی زندگی کی لمبی لمبی  
 اور سنان راتوں میں کتا نہیں لکھتا رہا تھا اور ان واقعات کو قلم بند کرتا جا رہا تھا میرے ساتھ  
 پیش آتے رہے تھے اور میں ان کتابوں کی وجہ سے ساری دنیا میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔

غم النہار پہلی عورت تھی جس نے میرے سن کے دروازے پر دستک دی تھی پھر  
 مجھے محسوس ہوا تھا کہ عورت کے بغیر مرد کی زندگی ادھوری اور بے کیف ہوتی ہے۔ زندگی  
 کا اصل حسن عورت ہے قدرت نے اسی لئے تو عورت کو تخلیق کیا ہے اگر اس دنیا میں  
 عورت نہ ہوتی تو پھر اس کائنات میں کوئی حسن اور کشش نہ ہوتی۔ اب میں بہت تھک چکا  
 تھا میں نے اس مردود اور درندہ خصلت پراسرار شکاری کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد  
 گھر رہانے کا تہہ کر لیا تھا۔

میرے تصور میں غم النہار مسکرا رہی تھی کہ اس کی جگہ بیگم جمال کے تراشیدہ



اسے بستر کے پاس لے گیا اور بستر پر بٹھادیا کبین میں ایک ہی کرسی تھی میں اس پر بیٹھ گیا میں اس انتظار میں تھا کہ وہ داخل ہو تو میں اسے پوچھوں اصل ماجرا کیا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مسٹر سالارا آپ کی اجازت ہو تو میں تھوڑی دیر کے لئے بستر پر لیٹ جاؤں؟“  
 ”ضرور..... ضرور.....“ میں نے جواب دیا۔ ”اس میں تکلف کی کیا بات ہے پلینز.....“

وہ بستر پر لیٹ گئی بستر پر جیسے ریشم کا گداز بکھریا بجلیاں تھیں کہ ٹوٹ پڑی تھیں۔ آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنی آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا تو میں نے پوچھا۔ ”بیگم! خیریت تو ہے؟ آپ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟“

جواب دینے سے پہلے اس نے اپنی لائٹ لائٹیں پلکیں جھپکائیں اور ایک لمبی سانس لی پھر وہ آہستگی سے کہنے لگی۔ ”میں کبین میں آکر کپڑے بدل کر سونے کے لئے بستر پر لیٹی تو تیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بار بار مجھے اس منوس جزیرے اور اس درندہ خصلت شکاری کا خیال آ رہا تھا جو انسانوں کا شکار کرتا ہے۔ اس خوف اور وحشت کے عالم میں نہ جانے کیسے میری آنکھ کھل گئی۔ معلوم نہیں کتنی دیر کے بعد میں بیدار ہوئی تو میں نے کلک کی آواز سنی۔ میں نے لاش آن کر کے دروازے کی طرف دیکھا تو میرے سارے جسم پر سنسنی سی دوڑ گئی کوئی باہر سے تالے میں چابی ڈال کر اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں ایک دم سے اچھل کر بیٹھ گئی پھر معامری نظر جتنی پر پڑی جو میں لگا بھول گئی تھی مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ میں بستر سے اتر کر دروازے کی طرف جاؤں میں نے جلدی سے سائینڈ ٹمبل پر سے پر اس اٹھا کر اس میں سے ہتھول نکال لیا۔“

وہ توقف کر کے سانس لینے لگی اپنی بات جاری رکھنے سے پہلے وہ تکیوں کے سہارے بیٹھ گئی پھر دونوں ہاتھوں سے منہ پرے ہوئے ریشمی بالوں کو سیٹھ کر انہیں جوڑے کی شکل میں باندھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”دوسرے لمحے کھناک سے کبین کا دروازہ کھل گیا پھر میں نے ایک چرہ دیکھا جو بہت ہی خوفناک اور مکررہ قسم کا تھا میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی کمرہ صورت نہیں دیکھی۔ ایسا چرہ کسی انسان کا ہو ہی نہیں سکتا ہے۔“ اس کے سارے بدن پر ایک جھربھری سی جھیل گئی۔ ”اس کی آنکھیں لال لال اور مت ہی بڑی تھیں اتنی بھیا تک تھیں کہ کیا بتاؤں۔ وہ انگاروں کی طرح دھبہ رہی تھیں۔ چہرہ مسوں، پھنسی

جمال کی سرسراتی آواز میں خوف کا عنصر صاف ظاہر ہو رہا تھا۔  
 میں نے جتنی گرا کر دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا بیگم جمال اس طرح سے کمرے میں داخل ہوئی جیسے کوئی غفریت اس کے تعاقب میں ہو۔ وہ حد درجہ خائف اور سراپسہ سی تھی وہ جیسے اپنے خواس میں نہیں تھی اس نے اندر داخل ہوتے ہی بجلی کی تیزی کے ساتھ کبین کا دروازہ بند کیا اور اس کی چٹنی چڑھا دی۔ اس کے ساتھ سے پرس فرش پر گرا اس نے اسے اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی میں نے اسے اٹھا کر سائینڈ ٹمبل پر رکھ دیا وہ دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اپنی آنکھیں بند کر کے لمبی سانسیں لینے لگی۔

وہ ریشمی سلینڈرک سوٹ میں لمبوس تھی اور اس کے لمبے سیاہ ریشمی بال اس کے چہرے شانے اور پیٹ پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے اس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا اور اس کی سانس دو ٹھکن کی طرح چل رہی تھی اور بے ترتیب ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ سینہ پر رکھ لیا تھا تاکہ سانسوں پر قابو پایا جاسکے۔ میں دل میں ششدر رہا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہو گا جس نے اسے اس بری طرح حواس باختہ کر دیا ہے درندہ خصلت شکاری نے اسے اغوا کرنے کی کوشش تو نہیں کی ہو گی پھر ایک خیال اور آیا کہ کسی مسافریا اسٹمبر کے غلطے میں سے کسی نے اسے تھما سکر کرتے دیکھ کر اس کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت تو نہیں کی۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا اس لئے کہ وہ تھی ہی ایک ایسی حسین عورت کہ کسی بھی مرد کے دل میں اسے تھما سکر کرتے دیکھ کر نیت میں فوری تبدیلی آ جانا فطری امر تھا اور پھر اس کے لباس اور جیجے نے مسافروں کو ادراک رکھ کر دیا ہو گا۔

میں نے ایک گلاس میں پانی بھر کے اس کے پاس جا کر اس سے کہا۔ ”بیگم جمال! آپ پانی پی لیں.....“

اس نے میری آواز پر اپنی پلکیں اٹھائیں اس کی حسین آنکھوں میں سے خوف، جھانک رہا تھا وہ کسی محوش رہتی کی طرح ابھی تک بری طرح سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کے سانسوں کے تلاطم میں رفتہ رفتہ کمی آنے لگی تھی۔ اس نے گلاس لینے کے لئے ہاتھ بڑھا تو وہ کانپ رہا تھا اس نے میرے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اسے ایک ہی سانس میں خالی دیا۔ وہ خالی گلاس واپس کرتے ہوئے بولی تو اس کی آواز میں لرزیدگی تھی۔ ”بہت برا شکر ہے۔“

میں نے پانی ہاتھ میں گلاس پکڑا اور دائیں ہاتھ سے اس کا نرم دھانک بازو

تھائی، تینوں مجھے زہریلی انگلیں لگ رہی تھیں۔

”اچھا آپ آرام کریں۔“ میں یک نخت اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں باہر کھڑا ہوتا ہوں تاکہ وہ شیطان آئے تو اس سے منٹ لوں۔“

”نہیں..... آپ باہر مت جائیں۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روکا۔ ”کیا معلوم وہ شیطان دوبارہ آجائے اور آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔“

میں اسے کیسے کتا کہ اس شیطان سے زیادہ خطرہ تو تم سے ہے۔ میں نے غیر محسوس انداز سے اپنا ہاتھ پھڑاتے ہوئے کہا۔ ”آپ میری فکر نہ کریں وہ شیطان آیا تو میں اس سے منٹ لوں گا۔“

اس نے مجھے پھر سمجھانے اور روکنے کی کوشش کی۔ ”آپ یہ مت بھولیں کہ آپ ایک شکاری ہیں وہ درندہ خصلت شکاری، شکاریوں کا سخت دشمن ہے اور اس نے آپ جیسے شکاریوں اور سیکڑوں انسانوں کو ہضم کر لیا ہے یلیز! اپنی جان کو جان بوجھ کر خطرے میں نہ ڈالیں۔“

میں نے آگے بڑھ کر کبکین کا دروازہ کھولا اس کی مخمور آنکھوں میں الجھ بھری تھی میں نے کہا۔ ”میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کس طرح ہضم کرتا ہے۔“

میں کبکین سے نکل آیا راہ داری سنان اور دیران پڑی تھی باہر گرمی تاریکی تھی باہر تیز ہوا تھی اور اس میں خشکی بہت زیادہ تھی۔ راہ داری میں روشنی جیسے اونگھ رہی تھی

میں ریٹنگ کے پاس کھڑا دھڑا کر دھڑکھنے لگا وہ شیطان نما آدمی کہاں سے آیا ہو گا؟ میرا ذہن سوچ رہا تھا۔ وہ کہاں چھپا ہو گا؟ کبکین ایسا تو نہیں کہ اسٹیر کے محلے میں سے کوئی شخص ماسک

چڑھا کر آیا ہو تاکہ اسے بیگم جمال پہچان نہ سکے۔ شاید اس نے میک اپ بھی کیا ہو شاید وہ اسٹیر کے اوپر والے عرشے میں چھپا بیٹھا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ درندہ خصلت شکاری کا

کوئی آدمی ہو مگر وہ فیصلہ نہیں کیا کیوں تھا؟ بیگم جمال کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر کس لئے بھاگ گیا۔ ان باتوں سے میرے اس شک کو تقویت مل رہی تھی کہ وہ بد معاش جواز کے محلے میں

سے تھا۔ اگر وہ درندہ خصلت شکاری کا کوئی آدمی ہو تو یقیناً مسلح ہوتا اور بیگم جمال پراسرار طور پر لاپتہ ہو چکی ہوتی۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ کیا میں اس شیطان کو تلاش کروں؟

میرے ذہن میں ایک گفتگو سی جاری تھی کہ میرے کبکین کا دروازہ کھلا بیگم جمال کا چہرہ نمودار ہو پھر وہ دروازہ بند کر کے میرے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ بڑی حد تک نارمل ہو گئی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے اعصاب مضبوط ہیں اس کی جگہ کوئی اور

وانوں اور زخموں سے بھرا ہوا تھا وہ انسان نہیں شیطان تھا۔ میری نس نس میں برف اترنے لگی بدن کا سارا خون خشک ہو گیا اور جسم کی ساری طاقت جیسے سب کر لی گئی ہو، پھر میرے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میری حالت ایک لرزے کے مریض کی سی ہو رہی تھی

میرا پستول والا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔ ”پلیز! ایک گلاس پانی دیجئے۔“

میں نے ایک گلاس پانی اس کی طرف بڑھایا تو اس نے پانی ایک ہی سانس میں حلق سے اتار لیا اس نے خالی گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا شروع کیا۔ ”وہ غیبیٹ اندر

داخل ہوا تو میری روح جیسے تپا ہو گئی۔ وہ میری طرف بڑھا تو اس کے بھیاک چہرے اور ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ناچ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے ہوس اور درندگی

جھانک رہی تھی۔ وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میری رانی میں تمہیں لینے آیا ہوں.....“ ٹیبل پر بہت دقت مہم اپنی تمام طاقت جمی کی اور اس کی طرف پستول تان لیا

شاید اس کی نظر پہلے پستول پر نہیں پڑی تھی وہ تو میرے چہرے کو گھور رہا تھا جیسے ہی اس کی نظر میرے ہاتھ اور پستول پر پڑی وہ بری طرح چونکا اور اٹلے قدموں کر کے سے نکل

بھاگا۔ میں باوجود کوشش کے اس پر فائز نہ کر سکی۔ اس کے نکلنے ہی میں نے ہسٹرے اتر کر دروازہ بند کیا پھر پستول اوپر اس اٹھا کر باہر بھاگا۔ راہ داری سنان اور دیران پڑی تھی

پھر مجھے بہت زیادہ خوف محسوس ہونے لگا تو میں آپ کے کبکین پر آکر دروازہ بجانے لگی۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا یہاں آگئیں۔“ میں نے کہا۔ ”اب آپ کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں آپ پوری طرح محفوظ ہیں۔“

”اگر میرے پاس پستول نہیں ہو تو آج میری عزت اور جان کی خیر نہ ہوتی وہ شاید مجھے اٹھا کر ہی لے جاتا۔“ وہ خوش سی ہو کر بولی۔

”پستول کیا آپ ہمیشہ اپنے پاس رکھتی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں..... اس لئے کہ یہ ایک طرح کا محافظ ہوتا ہے اور پھر اس کی وجہ سے کئی مرتبہ میری عزت بچ چکی ہے۔“ اس نے بتایا۔

پھر ہم دونوں باتیں کرنے لگے میں نے ایک انجانا سا خطرہ محسوس کیا مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی دل کہیں جا رہا تھا اور دماغ کہیں۔ رات کی تھائی اور گرمی خوشی میں کوئی بھی طوفان اٹھ نہ سکتا تھا ایک آتش نشین دیک رہا تھا جو کسی بھی لمحے پھٹ سکتا تھا۔ مجھے کبھی ایسی زندگی میں ایسی آزمائش سے گزرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ رات اور

”نہیں..... ابھی نہیں۔“ اس نے پانی کی لہروں پر نفیس بھاتے ہوئے کہا۔  
 ”میں ایک کھنڈہ اور یہاں کھڑی رہوں گی مجھے یہاں اچھا لگ رہا ہے۔“  
 وہ اندھیرے میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ ریٹنگ پر خطرناک حد تک جھکی ہوئی تھی  
 پھر اس نے ایک دم سے سیدھے ہو کر میرا شانہ ملایا اور ہڈیاں انداز میں جیٹی۔ ”سالارا!  
 مسٹر سالارا!..... یہ دیکھنے لاش تیرہری ہے۔“  
 ”لاش..... کہاں ہے؟“ میں بری طرح چوک پڑا اور اس کی طرف دیکھنے  
 لگا۔ ”ادھر.....“ اس نے اشارے سے بتایا۔ مجھے لاش دیکھنے کے لئے ریٹنگ کے  
 پائپ پر کھڑے ہو کر خاصا جھکنا لاش اسٹیمبر کے نیچے اور ساتھ ساتھ تیرہری تھی شاید  
 ..... دوسرے لمحے جب مجھے اپنی حماقت اور اپنے خلاف ہونے والی سازش کا  
 احساس ہوا تب دیر ہو چکی تھی بیگر جمال نے میرے دونوں پیروں کو پکڑ کر اٹھایا تو میرا  
 توازن بگڑ گیا میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں سر کے بل پانی میں جا کر ا۔  
 ایک شکاری نے دوسرے شکاری کو بڑی خوبصورتی سے شکار کر لیا تھا۔

☆-----☆-----☆

میرے پانی میں گرے ہی ایک زوردار جھپکا سا ہوا تھا اور رات کی گہری خاموشی  
 میں اس کا شور گونج کر سکوت میں ڈوب گیا۔ کسی نے اس شور کی آواز سنی نہ ہوگی اگر سنی  
 بھی ہوگی تو اس نے کوئی خیال نہیں کیا ہوگا اس لئے کہ ایسی آوازیں اسٹیمبر سے کوئی نہ  
 کوئی چیز پانی میں پھینکنے سے بلند ہوتی رہتی ہیں اور پھر اس نے مجھے پانی میں گرے ہوئے  
 دیکھا بھی نہ ہوگا اس لئے کہ آدمی رات کا وقت تھا اس وقت ہر کوئی گہری نیند کی آغوش  
 میں تھا اور طراح بھی اپنے اپنے کہیں میں آرام کر رہے تھے۔ یوں بھی اسٹیمبروں سے  
 مسافروں کی نپراسرار کشیدگی کی وجہ سے جو خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا اس وجہ سے کون  
 جاننے کی کوشش کرنا کہ یہ شوکر چیز کا تھا۔

میں نے فوراً ہی اپنے حواس کو قابو میں کر کے پانی کی سطح پر آنے کی کوشش کی اور  
 اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا جیسی میں نے بیگر جمال کی زہریلی ہنسی سن کر میرے  
 کانوں میں سیدھ بن کر کھینچنے لگی۔ میں نے غصے اور جھلہٹ سے اسٹیمبر کی طرف دیکھا جو  
 قریب ہی تھا یہ ایک بہت بڑا اسٹیمبر تھا میں نے چننا چاہا تو ایک تیز لہر نے مجھے فوراً اپنی لپیٹ  
 میں لے لیا۔ میرے منہ ناک اور آنکھوں میں پانی بھر گیا میری چیخ نکلی نہ سکی دوسرے لمحے  
 میں سنسٹھل کر چیخا تو تیرے اور اسٹیمبر کے درمیان فاصلہ بڑھ چکا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا

عورت ہوتی تو وہ کہیں سے کسی قیمت پر نہیں نکلتی۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”مسٹر سالار آپ واقعی ایک بہادر آدمی ہیں۔“  
 ”جب تک شکاری بہادر نہ ہو وہ شکار کھیل ہی نہیں سکتا“ یوں بھی باہر کھڑے ہونے  
 میں بہادر کی کیا بات ہے؟“  
 ”یہ بہادر کی کیا بات نہیں ہے تو اور کیا ہے۔“ وہ زیر لب مسکرائی۔ ”یہ جانتے  
 ہوئے بھی آپ اس اسٹیمبر سے سڑ کر رہے ہیں کہ شکاری نپراسرار طور پر لاپتہ ہو جاتے ہیں  
 اور ہر اس وقت باہر کھڑے ہیں جب خطرہ منڈلا رہا ہے۔“  
 ”ویسے آپ بھی کم بہادر نہیں ہیں۔“ میں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا تو وہ  
 سرخ ہو گئی۔ ”میں نے بہت کم ایسی بہادر عورتیں دیکھی ہیں۔“  
 ”میں اور بہادر.....؟“ وہ ایک دم کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ”میں نے کیا  
 بہادری دکھائی.....؟“

”آپ نے اس شیطان کو بھگایا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ کی جگہ کوئی اور  
 عورت ہوتی تو وہ بے ہوش ہو گئی ہوتی یا اس کا نشانہ بن جاتی۔“  
 ”میں نے اسے کہاں بھگایا.....؟ وہ ہسپتال دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا میرے پاس  
 ہسپتال نہ ہوتا تو معلوم نہیں میرا کیا حشر ہوتا؟“

”دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے اس واقعہ کا زیادہ اثر نہیں لیا آپ کی جگہ کوئی  
 دوسری عورت ہوتی تو وہ اب تک دہشت سے کانپ رہی ہوتی اور کہیں سے باہر آنے کی  
 جرأت نہیں کرتی۔ یہ آپ ہی کا حوصلہ ہے کہ آپ نے اپنے خوف پر پوری طرح قابو پا  
 لیا۔“

”آپ کی تعریف کا بہت بہت شکریہ۔“ وہ میرے قریب آ کر مسکرائے لگی۔  
 میں نے دستی گہری میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ ”رات کا ایک بجنے میں تین منٹ باقی  
 ہیں آپ اپنے کہیں میں جا کر سو جائیں صبح ہونے تک یہاں کھڑا ہوتا رہو گا اور  
 ہاں اندر سے چنچنی لگانا نہ بھولیں۔“

”رات کا ایک بجنے والا ہے.....؟“ وہ ایک دم سے چوکی پھر دوسرے لمحے  
 سنسٹھل کر بولی۔ ”نہیں..... میں نہیں سوؤں گی اب مجھے نیند کہاں سے آئے گی۔“  
 ”تو کیا آپ ساری رات جاگتی رہیں گی؟“ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جائیں شاید نیند  
 آجائے۔“

میں رخ تبدیل کر کے آہستہ آہستہ کتیرا تاجارہا تھامیرا رخ سیدھا اور اس روشنی کی طرف نہیں تھا۔ کوئی نصف گھنٹے کے بعد میں نے کنارے پر پہنچ کر روشنی کی طرف دیکھا تو وہ ٹال میں نصف میل کے فاصلے پر محسوس ہو رہی تھی۔

مجھے اتنا ترانہ ازہو چکا تھا کہ یہ گاؤں ہے کوئی تیرہ نہیں میں کنارے پر بیٹھ کر اپنی سانسیں درست کرنے لگا اور سر کے بالوں سے پانی کو ہاتھ سے نکالنے لگا بالوں کو دبا کر نچوڑنے پر پانی بدر نکلا تو بڑی دیر کے بعد میں مخالف سمت چل پڑا کوئی دو سو قدم چلنے کے بعد میرا ترانہ ازہو درست ثابت ہوا یہ ایک گاؤں تھا۔

چونکہ میرا انہم اور کپڑے بری طرح بھیگے ہوئے تھے اس لئے سردی سے برا حال ہو رہا تھا۔ میں جلد سے جلد ان کپڑوں اور لباس سے نجات پانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑی جھوپڑی کے دروازے پر پایا جو سیاری، ٹاربل اور کھل کے اونچے اونچے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ یہاں ایک پرہیزبیت سناٹا چھایا ہوا تھا اس جھوپڑی کے کین گہری نیند سو رہے تھے۔

اس جھوپڑی کے کین کو زمت دینے کے سوا چارہ نہیں تھا میری جیب میں اتنی رقم تھی کہ میں ان کی خدمت کا معقول معاوضہ دے سکتا تھا میں نے دروازے پر دستک دینے کے لئے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا تھا کہ میں نے چاہ سنی کوئی اس طرف آ رہا تھا پھر میں نے ایک آواز سنی وہ کہہ رہا تھا۔ ”سالار ڈوب گیا یا کسی اور طرف نکل گیا روشتی دیکھ کر بھی اس طرف نہیں آیا۔“

”ڈوبنا تو خیر نہیں ہو گا۔“ یہ آواز دوسرے آدمی کی تھی۔ ”وہ شخص ہے بہت تیز اور ہوشیار..... اتنی آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا۔“

میں بے آواز اور تیزی سے اس جھوپڑی کے عقب کی طرف بڑھ گیا یہ دو آدمی تھے ان میں سے پہلے نے کہا۔ ”ہمارا شکار کتنا ہی تیز اور ہوشیار کیوں نہ ہو وہ ہمارے جال میں پھنسے بغیر نہیں رو سکے گا۔ آخر اسے نغزے شکار کر لیا.....؟“

”وہ ایک حسین اور پرکشش عورت ہے اس کے جال میں اچھے اچھے آجاتے ہیں۔“ اس آدمی نے قہقہہ لگایا۔

”کیوں نہ تم..... اس جھوپڑی کو چپک کر کے دائیں طرف چلو میں بائیں طرف چلتا ہوں وہ یقیناً گاؤں میں داخل ہو چکا ہو گا۔“

”کین ایسا تو نہیں کہ وہ اس سمت تیرنے کے بجائے دوسری سمت تیر کے سامنے

تھا کہ پہلے جیسی ایک دوسری لہریری راہ میں حائل ہو کر مجھے ڈوبنے کی کوشش کرنے لگی چون کہ میں ایک ماہر تیراک تھا اس لئے اس لہر کا مقابلہ کر کے دیوانہ دارا استمبر کی طرف بڑھا پھر اپنی تمام قوت جمے کر کے ایک زوردار جارجی اور جدبائی انداز سے چلائے لگا۔ ”بچاؤ..... بچاؤ..... بچاؤ..... بچاؤ.....“

اس کے جواب میں ایک سنسنائی ہوئی گولی آئی اور میرے گزر گئی گولی کی وجہ سے میں خوفزدہ ہو کر رک گیا اور میرے بدن پر چوہو نیلیاں سی رہ گئیں۔ پھر دوسری گولی مجھ سے زرا فاصلے پر پانی کی نذر ہو گئی۔ پھر میں نے پانی کے اندر سے تیرتے ہوئے استمبر کی طرف بڑھنا شروع کیا کیے بعد دیگرے دو اور فائر ہوئے جو خاصے فاصلے پر کئے گئے۔ میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ میں نے چند لمحوں کے بعد پانی کی سطح پر آکر دیکھا تو میرا حوصلہ جواب دے گیا اس کے اور میرے درمیان اتنا فاصلہ پیدا ہو چکا تھا کہ میں اب اسے کچھ نہیں سکتا تھا ایک تو اس کی رفتار بہت تیزی تھی دوسری بات یہ تھی کہ اس کی تیز رفتاری جو لہریں چھوڑ رہی تھی وہ بہت بڑی تھیں۔ میرا چیتنا چلا نا بھی بے سود تھا میری چیتیں اس کے انجمن کے شور میں دب کر رہ گئی تھیں۔

میں بڑی حسرت سے استمبر کو جاتا دیکھا کہ اس کی تیاں اندھیرے کی وسعتوں میں گم ہو گئیں اور گہرے سکوت کے باوجود اس کے انجمن کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی میں چاروں طرف دیکھنے لگا گھپ اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ بٹھائی نہیں دے رہا تھا کنارہ کہاں سے دکھائی دیتا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس سمت بروں۔

پانی بے حد سرد تھا اور رسی سی کسر تک ہوا نے پوری کر دی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس جگہ ڈوب مرنے سے تو بہتر ہے کہ میں کسی سمت تیرنا شروع کر دوں۔ میں تیرنے کے لئے اپنا جسم تول رہا تھا کہ مخالف سمت خاصے فاصلے پر روشنی کی کرن سی دکھائی دی کسی جھوپڑی میں جیسے چراغ عل رہا ہو یہ روشنی کی کرن میں جھکی تھی امید کی کرن تھی کنارے کے وجود کی نشانی تھی۔

میں نے تیزی اسی سمت تیرنا شروع کر دیا تھا! چاک ایک خیال میرے دل کے کسی گوشے میں آیا تو میں نے اپنی رفتار سست کر دی اور اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ یہ روشنی دشمن نے کی تھی تاکہ میں کنارے پہنچوں تو مجھے دھریا جائے بیگم ہمال نے دانستہ مجھے ایسی جگہ دھکا دے کر گرا رہا تھا جہاں اس کے آدمی تھے اس طرح شکایوں کا شکار کیا جاتا تھا۔

میرا سمجھ گیا تھا کہ میرا دشمن میرے استقبال کے لئے کنارے پر موجود ہو گا اس لئے



تھا جو اس آدم خورد شکاری تک پہنچا سکے۔ مشتاق چوہدری نے مقل یہ بتایا تھا کہ وہ آدم خورد ایک جزیرے پر رہتا ہے۔

جینل نارچ سے اس کے چہرے پر روشنی ڈالنا خطرے سے خالی نہیں تھا میں نے کھڑے ہو کر اس بد معاش کی انگلیں پکڑ لیں اور اسے گھسیٹا ہوا درلے گیا وہاں جھاڑیاں تھیں ان جھاڑیوں کے پاس جا کر اسے جھاڑیوں میں چھپا دیا پھر میں نے جینل نارچ نکال کر اس کے چہرے پر روشنی ڈالی تو اچھل پڑا۔ یہ وہی بد معاش تھا جس نے ڈھاکا ایئر پورٹ پر مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا میرے بچائے ختم اتار اور غریب ٹینسی ڈرائیور زخمی ہو گئے تھے۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ اس کا چاقو اس کے سینے میں اتار دوں میں نے اس بے رحم خیال کو جھٹک دیا۔ میں اپنے ہاتھ انسان کے خون سے رنگنا نہیں چاہتا تھا۔ البتہ اسے سخت ترین سزا دینا چاہتا تھا۔

میں نے اس کی جیب سے دو مال نکال کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ پھر اس کے کپڑے اتار کر اس کی مشکلیں کس دیں۔ پھر میں بے آواز تدموں سے جھوپڑی کی طرف بڑھا۔ دروازے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ چند لمحوں کے بعد دروازے پر دستک دی۔ وقفے وقفے سے دروازے پر تین چار مرتبہ دستک دینے کے بعد اندر سے ایک عورت کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز بھری۔ ”کون ہے؟“

”میں..... ایک مسافر ہوں۔“ میں نے دروازے سے منہ چپکا کر آہستہ سے کہا۔

”مسافر..... کون مسافر؟ اپنا نام بتاؤ.....“ عورت کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔ ”میں نے تمہیں نہیں پہچانا۔“

”میں ایک اجنبی آدمی ہوں۔“ مجھے اس کے سوال و جواب پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ اس بد معاش کا ساتھی اور ہٹکل آئے گا تو وہ میری آواز سن لے گا پھر میری شامت آجائے گی۔ اس نئی افتاد سے لگنا میرے لئے بہت مشکل ہو جائے گا۔ میں نے نہ سکون انداز میں کہا۔ ”گھر میں کوئی آدمی ہے تو اس سے کہو کہ وہ مجھ سے بات کرے۔“

”اچھا..... ایک منٹ ٹھہرو۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں اب کو بجاتی ہوں۔“

مجھے تھوڑی دیر تک بڑے کرب سے اس کے کپ کے جانگے کا انتظار کرنا پڑا۔ لفظ لفظ میری بے قراری اور بے چینی پر مبنی جاری تھی وہ اندر اپنے باپ کو بگانے کی کوشش کر رہی تھی اس کا باپ گہری نیند میں ملوث ہو اتھا وہ جانگے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

دالے گاؤں میں پہنچ گیا ہو۔“

”وہ کہیں بھی پہنچ جائے ہم سے بچ کر نہیں جا سکتا شمسو اور غمرو اس کی تلاش میں کشتی لے کر نکل چکے ہیں۔“

”اس جھوپڑی میں خاموشی ہے شاید وہ یہاں نہیں پہنچا..... پہنچا تو آمار مل جاتے۔“

”دیکھو، اگر یہ سالار بچ کر نکل گیا تو صرف ہم دونوں ہی کی نہیں سبھی کی شامت آجائے گی۔ پاس ہمیں بچنے کا نہیں۔ وہ ہریت پر سالار کو اپنی قید میں دیکھنا چاہتا ہے۔“

ایک تو دائیں طرف بڑھ گیا تھا اس کی چاپ بتا رہی تھی دوسرا جھوپڑی کی طرف آ رہا تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کے پاس کس قسم کا اسلحہ ہے۔ میری جیب میں ریو اور تھا اب اس کی گولیاں پانی میں میٹھنے کی وجہ سے بیکار ہو چکی تھیں میں اس ریو اور سے دشمن کے سر پر ضرب لگانے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتا تھا۔ ادھر دشمن پوری طرح گھات میں تھا میری تلاش میں ایک وہ نہیں لگی بد معاش تھے۔ میں کھل کے درخت کے تنے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا جب سے ریو اور نکال کر اسے الٹا پکڑ لیا۔

وہ بد معاش جھوپڑی کے دروازے پر پہنچ کر کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا چند لمحوں تک کان لگائے کھڑا رہا پھر دھوم کر بیچھے کی طرف دبے تدموں بڑھا جیسے اس نے میری خوشبو سونگھ لی ہو۔ جب وہ اس درخت کے پاس سے گزرنے لگا جہاں میں چھپا کھڑا تھا میں نے ریو اور کا دست اس کے سر کے پچھلے حصے پر دے مارا اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکلی وہ دھپ سے زمین پر گر پڑا۔

میں نے چند لمحوں تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اس کے گرنے کی آواز سن کر اس کا ساتھی آ سکتا تھا شاید وہ زیادہ دور نہ گیا ہو میں اس سے چند قدم ہٹ کر ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں تک سانس روکے ادھر ادھر دیکھنا جب میں نے دیکھا کہ کوئی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تو میں اس بد معاش کی طرف بڑھا اور اس کے پاس پہنچ کر زمین پر دو زانو بیٹھ گیا۔ اس گھپ اندھیرے میں اس کا چہرہ اور رخ و خال واضح نہیں تھے بے حس و حرکت پڑا تھا میں نے اس کے سر پر کاری ضرب لگائی تھی وہ تین چار گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے اس کی جیبوں کی تلاش کی تو اس میں تین سو ٹاکا ریو گاری ایک جینل نارچ اور ایک خوفناک قسم کا چاقو نکلا۔ میں نے اس کی ساری چیزیں اپنی جیب میں رکھ لیں مجھے جس چیز کی تلاش تھی وہ نہیں نکلی میں کسی ایسی چیز کی تلاش میں

بوڑھے نے دھکی دی۔

”اگر تم لوگ مجھے پناہ دو تو میں تمہیں اس کے عوض رقم دوں گا۔“ میرے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

”رقم.....؟“ اس بوڑھے نے پہلے عورت کی طرف حیرت اور خوشی سے دیکھا پھر مجھ سے بولا۔ ”مگر تم رقم دو گے؟“

”دوسو ٹاکا.....“ میں نے بوڑھے کی آنکھوں میں لالچ کی چمک دیکھی تو اوپر کی جیب سے وہ رقم نکالی جو بد معاش کی تھی اس میں سے سو سو ٹاکا کے دو نوٹ اس کی طرف بڑھا دیے۔ ”یہ رکھ لو.....“

وہ میرے ہاتھ سے رقم لے کر کسی بچے کی طرح خوش ہو گیا۔ اس نے رقم جیب میں رکھنے کے بعد ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ عورت بھی تیزی سے ایک طرف ہٹ گئی۔ میں نے عورت کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر دمک تھی اور آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی تھی۔ وہ بوڑھا سرت اخیر مجھے میں بولا۔ ”آجاؤ..... آجاؤ بڑے صاحب جی..... جلدی سے اندر آ جاؤ۔“

یہ دولت کا جادو تھا جس نے باپ بیٹی کو بھلی کی بی تیزی کے ساتھ متاثر کیا تھا اور وہ برف کی طرح کھل گئے تھے۔ ان کے لب و لہجے میں نرمی اور زبان میں ساری دنیا کی محاسن آگئی تھی ان کا رویہ میرے ساتھ ایسا تھا جیسے میں اس گھر کا کوئی فرد ہوں۔ وہ میرے آگے بچھا جا رہا تھا۔

”رقم بیٹی!“ اس نے عورت کو مخاطب کیا۔ ”جلدی سے تین کپ چائے بنا کر لاؤ بڑے صاحب کے لئے بڑے پیالے میں لے آنا.....“

وہ کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے کے اندر میرے ہم تم ہو گئی۔ بوڑھے سے میں نے پوچھا۔ ”آپ کا نام کیا ہے؟“

”میرا نام نر دوسہ.....“ اس نے جواب دیا۔ ”میں آپ کو اپنے کپڑے دوں بڑے صاحب جی آپ کپڑے سو کھنے تک انہیں پن رکھیں۔“

میرے ہائی بھرے پر اس نے کمرے میں بندھی سی پر لٹکتے ہوئے بہت سارے کپڑوں میں سے ایک لٹکی اور قبضہ نکال کر میری طرف بڑھائی۔ میں نے کپڑے بدلنے ہوئے اس کے کمرے کو دیکھا۔ ایک غریب آدمی کا گھر تھا۔ اس کے گھر سے اس کی غربت ظاہر تھی۔ اس کے کپڑے بھی بے حد معمولی تھے۔ اس کی بیٹی نے جو ساڑھی پن رکھی تھی

دروازہ کھلا تو میری نظروں کے سامنے ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا جس کے چہرے پر سفید خشکی داڑھی تھی۔ وہ دبلا پتلا، کمزور اور لاغر سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری تھی اور اس پر نشے کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔

اس کے پیچھے ایک جوان عورت کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چراغ تھا جس کی روشنی میں ان دونوں کی دیکھ رہا تھا۔ وہ عورت میں بائیں برس کی ہوگی۔ اس کی رنگت گہری ساوئی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھی نیند کا غلبہ تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی اور اس کی آنکھوں سے ایک انجانا خوف جھانک رہا تھا۔

”آپ کون ہیں بھائی.....؟“ اس بوڑھے نے اپنا سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا چاہتے ہو؟“

”میں ایک میٹھا فروشوں اور رات آپ کے باں گزارنا چاہتا ہوں۔“

”آپ اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہیں۔“ عورت کے چہرے پر استعجاب چھا گیا۔ ”آپ کس سے آ رہے ہیں؟ اس وقت یہاں کوئی لالچ نہیں آتی..... اور آپ کے یہ کپڑے جھگے ہوئے کیسے ہیں؟“ وہ ایک ہی سانس میں بول گئی۔

میں نے جواب دینے سے پہلے پلٹ کر اندر میرے میں چاروں طرف دیکھا اور بولا۔ ”اندرا آنے دیں تو بتاؤں..... میری جان کو خطرہ ہے۔ مجھے آپ لوگ اپنے گھر میں پناہ دیں تو میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی میں بھولوں گا۔“

”جان خطرے میں ہے.....؟“ بوڑھے نے چونک کر دریا اور اپنی گردن گھما کر عورت کی طرف دیکھا عورت کی آنکھوں نے غیر محسوس انداز سے نفی میں جواب دیا۔ وہ بوڑھا میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”نا..... معلوم نہیں کیا پتھر ہے۔ ہمیں معاف کرو۔“

وہ بدحواس سا ہو کر دروازہ بند کرنے لگا تو میں نے دروازے میں جلدی سے اپنی ٹانگ اڑا دی۔ ”میریں بات تو سنو صرف ایک منٹ پناہ چاہتے۔“

”ہم ایک گھنٹے کے لئے بھی پناہ نہیں دے سکتے۔ معلوم نہیں تم کون ہو؟ شاید بہت بدستانی جاسوس ہو۔“ بوڑھا حد درجہ خائف ہو رہا تھا۔

”میں جاسوس نہیں ہوں بلکہ ایک مصیبت زدہ ہوں۔ خدا کے لئے مجھے اندر آنے دو.....“

”اگر تم نہیں گئے تو ہم جینا چلتا شروع کر دیں گے۔ سارا گاؤں جمع ہو جائے گا۔“



اس میں 'میں نے کئی جگہ پیوند لگے دیکھے تھے۔

رقیقہ تو دوا دیر کے بعد مٹی کے پیالوں میں بھاپ اڑا رہی ہوئی چائے کے کرچی سے پیالے اس نے ایک رکالی میں رکھے ہوئے تھے۔ ان میں جو بڑا پیالہ تھا وہ اس نے سیری طرف بڑھا دیا۔ چھوٹے پیالے باپ بیٹی نے لے لئے۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ چائے بہت اچھی تھی۔ مگر کئی مٹھاس تھی اس میں۔ پہلے گھونٹ سے میرے سارے بدن میں حرارت کی لہر دوڑ گئی۔ میں تو ان کی سی محسوس کرنے لگا۔

”میں مزدور آدمی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”پان کے باغ کا ایک ٹھیکیدار ہے اس کے پاس یو میہ اجرت پر کام کر رہا ہوں۔“

جب میں چائے پی چکا تو زور دے مجھ سے کہا۔ ”بڑے صاحب جی! آپ اپنے کپڑے دے دیں تاکہ رقیہ انہیں صحن میں لے جا کر رسی پڑا لے دے۔ صبح تک آپ کے کپڑے سوکھ جائیں گے۔“

میں اپنے پہلے کپڑوں کی جیسیں بنائی کرنے لگا۔ ان دونوں نے میرا رپا اور اور چاٹو دیکھا تو ان کے چہرے ایک لمحے کے لئے فک ہو گئے۔ میں نے بڑھ 'رومال اور چاپایا نکال لیں۔ میں نے بڑھ سے سوٹ نکال کر دیکھا تو وہ پہلے نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے کہ میرا بڑھ ہی تھا اور میں نے زپ لگا رکھی تھی۔ میں نے تمکے کپڑے رتہ کو دے دیئے۔

رقہ گیلے کپڑے صحن میں پھیلا کر رکھی اور اس چوکی پر میرے لیے بستہ لگانے لگی۔ میں نے بڑو کو مختصر طور پر اپنے ساتھ پیش آنے والا وعدہ سنایا۔ میں نے دانستہ اسے دو ہادشاہوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا، جن میں ایک تو میری تلاش میں گاؤں کے اندر چلا آیا تھا۔ دوسرا جسے میں نے بے ہوش کر کے اس کی مٹکیوں کس کر جھو پیڑی کے عقب والی جھاڑیوں میں ڈال آیا تھا۔

میں نے اس سے پراسرار مزاج سے اس کدم خور، استنبیہ اور لالچوں سے بڑا سرا  
 طور پر غائب ہونے والے شکاریوں اور مسافروں کے بارے میں پوچھا۔ اسے صرف اتنا پتا  
 تھا کہ استنبیہ اور لالچوں سے دقیقاً فوقی مسافر غائب ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں مرد  
 لڑکیاں اور عورتیں بھی ہوتی ہیں اس نے بتایا کہ ان خبروں سے گاؤں میں خوف و ہراس  
 پایا جاتا ہے اور لوگ دن ڈوبنے کے بعد اکیلے گھر سے نہیں نکلتے۔ لالچ کے وقت  
 کوئی یہاں آتا بھی نہیں ہے۔

رقیب نے بہتر لگا دیا تھا۔ بہتر میلا پکلا تھا مگر نرم اور بے حد گرم بھی تھا محسوس کرنے کے لیے اسے مجھے نیند بھی آ رہی تھی لیکن اپنا ہاتھ، پنسل، مارجن، چاقو اور ریو اور نیکی کے نیچے رکھ لیا۔ میں بہتر رہنا تو بے بسی ہی کا رخ ہے کہ دوسرے کر کے میں چلے گئے اور میرے کر کے

”مکان بیچ کر چلا جاؤ۔“

ہیں اور پھر آج کل ہر آدمی مکان بیچ کر پاکستان جانا چاہتا ہے اس لئے مکان خریدنے والا

اس کی قیض چھوٹی تھی میرے جسم پر تنگ بھی ہو گئی تھی مگر میں نے کسی نہ کسی

میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک پرائیویٹ جیل میں سب سے زیادہ سزا دینے والے جیل گارڈ کی حیثیت سے میری زندگی کیسے گزرے گی۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک پرائیویٹ جیل میں سب سے زیادہ سزا دینے والے جیل گارڈ کی حیثیت سے میری زندگی کیسے گزرے گی۔

دروازہ بھینڑ دیا۔ کمرے میں اندر مچھا چھایا۔

میں بیدار ہوا تو سراسر بھاری ہو رہا تھا اور مجھ پر نئے کی سی کیفیت طاری تھی میں سر جھٹک کر اٹھ بیٹھا صبح ہو چکی تھی اور کمرے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ دن خاصا نکل آیا تھا۔ میں نے کمرے میں ایک عجیب اور پراسرار خاموشی محسوس کی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے گھر میں میرے سوا کوئی نہ ہو۔ میں نے بستر سے نکل کر قدام کرنے پر باورچی خانہ، صحن و غسل خانہ بھی دیکھ لیا ان دونوں کا نام و نشان نہ تھا۔ صحن میں رہی پر میرے کپڑے پھیلے ہوئے تھے اور وہ سوکھ چکے تھے۔ میں اپنے کپڑے کمرے میں لے آیا انہیں پہنتے ہوئے حیران تھا کہ یہ دونوں کہاں گئے؟

میں نے نکلے بنایا تو ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ میرا بڑا غائب تھا جس میں چار ہزار کی رقم موجود تھی۔ چاقو، چابوں اور دیوار کو انہوں نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ میری رقم چوری کر کے فرار ہو گئے تھے تاکہ پاکستان جا سکیں۔ غربت و افلاس نے انہیں چوری کرنے پر اکسایا تھا۔ ورنہ وہ ایسے نہ نکلتے تھے۔ میرا سراسر بھاری اس لئے ہو رہا تھا کہ میری چائے میں نشہ ملا دیا گیا تھا۔

میں تھوڑی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا اس بات کی امید تھی کہ بد معاش رات میری تلاش میں ناکام ہو کر جا چکے ہوں گے۔ میں یہاں سے گزرتی ہوئی کسی بھی لالچ سے نکل سکتا تھا۔ دن میں کسی خطرے کی بات نہ تھی دن کا سفر میرے لئے زیادہ بہتر تھا۔ دن میں لاٹھیں اور اسٹیر یہاں سے گزرتے ہوں گے۔ سفر کے اخراجات کے لئے میرے پاس گھڑی تھی۔ وہ میری دس گھڑی جلدی میں اتارنا بھول گئے تھے یا ان کی اس پر نظر نہ پڑی ہوگی۔

میں تھوڑی دیر کے بعد عقیق راسے سے باہر آیا۔ یہ راستہ جھاڑیوں کے پاس سے ہوتا ہوا ندی کے کنارے کی طرف جاتا تھا۔ باہر بھی گمراستا تھا اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ ندی کے کنارے درودور تنک کسی کا پتہ نہیں تھا۔ میں جھاڑیوں کے پاس سے ہوتا ہوا ندی کی طرف جانے لگا تو مجھے ایک جگہ پر نشان نظر آئے۔ یہ وہ نشان تھے جو کسی آدمی کو کھیت کر لے جانے کے تھے اور جھاڑیوں کے پاس جا کر ختم ہو گئے تھے۔ یہاں بوٹوں کے بھی نشان تھے۔

میں نے جھاڑیوں کے پاس جا کر جھانکا ہاں اس بد معاش کا پتہ نہ تھا۔ بڑی حیران کن بات تھی کہ وہ بد معاش کہاں اور کیسے چلا گیا۔ رات کے وقت اس کا پتہ چلا نا آسان نہیں تھا۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد اٹھ کر جا بھی نہیں سکتا تھا اس لئے کہ میں نے اس کی ٹھیکیں

خوب کس کر باندھی تھیں۔ اس بات کا امکان تھا کہ میں نے غلت میں شاید ٹھیک سے گرہ نہ لگائی ہو۔

مجھے اس بد معاش سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں یہاں سے جلد سے جلد نکل جانا چاہتا تھا اس لئے تیزی کے ساتھ ندی کے کنارے کی طرف بڑھ گیا۔ ندی کے کنارے پر پہنچا تو درودور تنک کی کانام و نشان نہ تھا البتہ نصف میل پر گھاٹ دکھائی دے رہا تھا۔ گھاٹ پر بھی کوئی نہیں تھا۔

یہ بہت بڑی ندی تھی اور بل کھاتی ہوئی ایک گاؤں کے پاس سے گھوم گئی تھی۔ ندی کے اس پار ایک گاؤں تھا۔ وہاں کنارے پر لڑکیاں اور عورتیں برتن اور کپڑے دھو رہی تھیں اور پانی میں کھڑے ہو کر نہا رہی تھیں۔ چھوٹے بڑے سبھی بچے نہا رہے تھے۔ میں نے ایک لالچ کو آتے دیکھا جو گاؤں کے پیچھے سے نمودار ہوئی تھی۔ یہ کارگر لالچ تھی۔ اس کے عرشے پر بھری بوئیاں اور کچھ سامان رکھا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے لالچ اور ہلائے کو کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد لالچ کنارے آگئی۔ عرشے پر جو دو آدمی کھڑے تھے ان میں سے ایک نے پوچھا۔ ”آپ کو کہاں جانا ہے؟ ہم کھانا جا رہے ہیں۔“

”کھانا ہی جانا ہے.....“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے آپ اوپر آجائیں۔“ انہوں نے ایک لمبا تختہ اٹھا کر ریگ کا دروازہ کھولا۔ اس تختے کو نیچے اتارا۔ اس کا ایک سر ریگ کے پاس فرش پر رکھا اور دوسرا ٹنگلی پر ٹکا دیا۔ میں تختے کے بغیر لالچ پر نہیں جا سکتا تھا کیونکہ میرے اور لالچ کے درمیان پانی مائل تھا۔ لالچ گھاٹ پر ہوتی تو مجھے تختے سے اوپر جانے کی ضرورت نہ پڑتی اور پھر لالچ کا عرشہ پانی کی سطح سے اتنا اونچا تھا کہ میں پانی میں جا کر بھی ریگ کو پکڑ نہیں سکتا تھا۔ میں تختے پر سے ہوتا ریگ کے پاس پہنچا تو ایک آدمی نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے عرشے پر بٹھایا۔

میرے عرشے پر قدم رکھتے ہی ان دونوں نے مل کر تختے کو اوپر کھینچ لیا اور اسے اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ پھر لالچ چل پڑی ان میں سے ایک شخص نے زینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نیچے جا کر کیبن میں بیٹھ جائیں، آرام کریں، اس میں بستر بھی ہے۔“

میں نے کاک پٹ کی طرف دیکھا اس میں ایک موٹا اور بھدرا سا آدمی تھا جس کے

"رات میں نے جس کے ہاں قیام کیا تھا اس بے اور اس کی بیٹی نے میری جیب پر بھی ہاتھ صاف کر دیا۔ وہ میرے بھی تین ہزار نکالے کر رات کو بھاگ گئے۔"

"تم جھوٹ بول کر میری رقم اور چیزیں ہڑپ نہیں کر سکتے۔ میرے ساتھی تمہارے چرے کا بغیرانیہ لگا ڈریں گے....."

"اجھا تو میری تلاش ہی لے لو....." میں نے میز پر کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے۔

”اے او شامو!“ اس نے بتول لئے کھڑے شخص کے شانے کو بلایا۔ ”تُو ذرا اس کی تلاش تو لینا۔ دیکھنا ہے کہ یہ کتنا بچ بول رہا ہے۔ ہمیں بے وقوف سمجھ رہا ہے۔“ وہ اپنی جیب میں بتول رکھ کر میری طرف بڑھا۔ میں اسی موقع کی تو تک میں تھا۔ میرے پیچھے زینے پر کوئی نہیں تھا۔ میں اس وقت سفاری سوٹ میں لباس تھا۔ اس نے میری دونوں جینیں تھپ تھپ تھپائیں۔ اس نے ایک جیب میں ریو اور محسوس کر کے اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا مگر ٹخن کھول کر ریو اور نکال سکے۔ میں نے بے حس و حرکت کھڑا رہ کر اسے کارروائی کرنے دی۔

وہ میرے غیر متوقع تعاون کی وجہ سے ذرا سے غافل ہو گئے تھے۔ وہ میری جیب کا بٹن کھولنے لگا تو میں نے اس کے پیٹ میں پوری قوت سے ایک لات رسید کی وہ الٹ کر اپنے ساتھیوں پر جاگرا کہ وہ بری طرح چیخاڑھا تھا۔

میں دوسرے لمبے عرشے پر تھا۔ عرشے پر وہ دونوں بد معاش ریڈنگ کے سہارے کھڑے بیڑی لی رہے تھے اور کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ جیسے ہی میں نے عرشے پر قدم رکھا نیچے سے آوازیں میرا تعاقب کرنے لگیں۔ ”پکڑو..... پکڑو..... جانے نہ جائے۔“

وہ دونوں آواز سننے ہی چکے، 'انہوں نے مجھے دیکھا تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ میری طرف لپکے۔ نیچے سے بھی کوئی اوپر اُپر ہاتھائیں سے پک کر نہیں دیکھا اور نہ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ وہ دونوں اتفاق سے غیر مسلح تھے۔ میں پلٹ کر دوسری سمت تیزی سے دوڑا۔ وہ دونوں میرے پیچھے پیچھے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ میں ریٹک کے پاس پہنچا تھا کہ ایک بعد دیگرے تھوہر دوڑا کر ہوئے۔ ایک گولی تو میرے دائیں ہیکر کے پاس سے سنسنائی ہوئی گزری تو دوسری میرے سر پر سے گزرنی۔ اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کوئی مجھے پکارتا میں نے ریٹک پر چڑھ کر اپنی میں جھلائی لگا دی۔ ان

چہرے پر کالے رنگ کی عینک لگی تھی وہ دھنکیل کے پاس کھڑا اسے حرکت دے رہا تھا۔ میں زینے کی طرف دبوھا۔ ایک چھوٹی سی میزمری تھی جس میں چار تختے لگے تھے میں نے تیسرے تختے پر قدم رکھا کھسکا کر سامنے والے کبین کا دروازہ کھلا اس میں سے تین آدمی میرے استقبال کے لئے باہر آئے میں ٹھنک گیا۔

وہ تینوں اپنی وضع قطع اور چرے مڑے سے دس نمبری دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے چروں پر خباثت، سفاکی اور بے رحمی تھی۔ ان کی آنکھوں سے استہزائی پلن جھانک رہا تھا۔ ایک کے ہاتھ میں ایک کھلا ہوا قہقہا سا پھل خوشامکھ تھا اور وہ چپک رہا تھا۔ باقی دو جو تھے ان کے ہاتھوں میں پتول تھے۔ وہ زینے سے دو قدم پر کھڑے ہو گئے اس کیمین میں سے ایک اور بد معاش نمودار ہوا جس کے سر پر چٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں اسے دیکھ کر چونک پڑا یہ وہی بد معاش تھا جسے میں نے زخمی کر کے جھاڑیوں میں ڈال دیا تھا۔ وہ تسخیر سے بولا۔ ”خوش آمدید مسز ملارا! آخر تم ہمارے چال میں پھنسی ہو گئے نا.....؟“

”ہاں.....“ میں نے سر ہلا کر اعتراف کیا اور غیر محسوس انداز سے سب سے اونچے والی میز پر بیٹھ گیا۔ ”تم لوگ جیت گئے میں ہار گیا۔ مگر میری یہ شکست عارضی ہے۔ آخر میں فتح میری ہی ہوگی.....“

”اچھا.....“ اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ ”ہاتھ کلن کو آ کر کیا..... وہ بھی دیکھ لیے۔ آج تک ہمارے جال میں آکر کوئی کچ نہ کل سکا۔“

”میں تمہارے اس غور سے مت کوڑے کے پاش پاش کر دوں گا۔ تم مجھے آسانی سے شکار نہ کر سکو گے۔“ میں نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”تم نہیں جانتے کہ تمہارا واسطہ کس سے پڑا ہے؟“

”اس میں کوئی شک نہیں کہ تم سب سے خطرناک عکاس ثابت ہوئے ہو۔“ اس نے اعتراف کیا۔ ”کل رات تم نے میرا سر بچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ کہو کہ مجھے بوش اٹھایا اور میری کراچی میرے دوست نے سن لیں۔“

”آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو اور میرے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

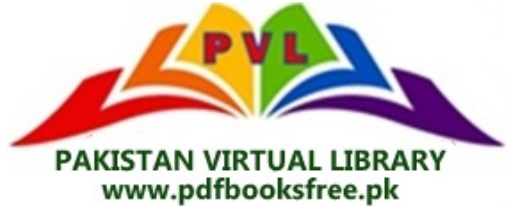
”یہ ہمارے پاس کا حکم ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”شرافت سے میری رقم اور میری چیزیں واپس کر دو.....“

”میرے پاس سوائے تمہارے چاقو کے کوئی اور چیز نہیں ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔

دونوں نے بھی میرے پیچھے پیچھے چھلانگ لگادی۔ چونکہ میں ماہر پیراک تھا اس لئے اور گہرائی میں جا کر تیرتا ہوا پانی کی سطح پر آیا تو میں لالچ کی دوسری طرف اور عقبی حصے پر تھا۔ پانی میں دو اور آدمی شاید کود پڑے تھے اور وہ چاروں بیچ چلا رہے تھے۔ اس طرف کوئی نہیں تھا ایک رسی لٹک رہی تھی جس کا سر پانی میں ڈوب رہا تھا۔ میں نے کسی کے اس سمت آنے کی آواز سنی تو وہ بڑی آہستگی سے پانی کے اندر چلا گیا اور رسی کا سرا پکڑ لیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ دونوں پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے نکل گئے۔ پھر میں پانی کی سطح پر ابھرا تھا کہ میرے سر پر کسی سخت چیز کی ضرب لگی تو میرا سر پکڑا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر میں تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆-----☆



میں شاید دو ایک دن بے ہوش رہا مجھے شاید بے ہوشی کا انکشاف دے دیا گیا تھا اس لئے کہ جب میں ہوش میں آیا تو میں لالچ کے کین میں نہیں بلکہ ایک ہسپتال جیسے کمرے اور ایک بیلنگ کے صاف ستھرے بستر پر پڑا تھا۔ میرے بدن پر مریضوں کا لباس تھا۔ میرا سر بھاری ہو رہا تھا اور نشہ سا چھایا ہوا تھا یہ نئے کے انکشاف کا اثر تھا جو ابھی پوری طرح اترا نہیں تھا۔

میں نے اپنا سر ہتھک کے سامنے کی طرف دیکھا جہاں کھڑکی تھی اس کھڑکی میں لوہے کی مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اور اس پر ایک سفید پردہ پڑا تھا۔ پردے میں سے سورج کی روشنی چھن چھن کر کمرے کے اندر آ رہی تھی۔ کمرے کے اندر اور باہر گہرا گہرا سا چھایا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی دیرانی بھی برستی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے اندازہ لگایا کہ یہ عمارت کسی گاؤں میں واقع ہے۔ دوسرے لمبے اس خیال کی نفی ہو گئی۔ اس لئے کہ چھت پر لٹکا ہوا ایک ٹیوب لائٹ لگی ہوئی تھی۔ یہاں ہزاروں گاؤں اور علاقے آج بھی ایسے تھے جہاں بجلی نہیں پہنچی تھی۔ بیچ بھی نہیں سکتی تھی اس لئے کہ ہر سال جو طوفان آتے تھے وہ مواصلات کے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیتے تھے۔

میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو سارے بدن میں کمزوری سی محسوس ہوئی۔ میں کسی نہ کسی طرح اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد سوچا کہ اب مجھے دیکھنا چاہئے کہ میں کہاں ہوں یہ عمارت ہسپتال کی ہے یا کوئی مکان وغیرہ ہے۔ میں بستر سے اترنے والا تھا کہ کمرے کے باہر چاپ کی آواز سنائی دی۔ کوئی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا شاید اس کمرے کی طرف آ رہا تھا میں نے فوراً ہی بستر پر لیٹ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

چند لمبے بعد دروازہ کھلا۔ میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ تھکے پر گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا کہ کمرے میں ایک جوان نرس چھوٹی سی ڈنٹے اٹھائے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی وہ اندر داخل ہو کر

”کیا یہ انجشن بھی بے ہوشی کا ہے؟“ میں نے فیض کی آستین بچھ امارتے ہوئے دریافت کیا۔

”جی نہیں.....“ وہ مسکرائی۔ ”یہ طاقت کا انجشن ہے اب آپ غسل خانے میں جا کر نمائیں۔ شیو کر لیں اور تیار ہو جائیں۔ میں اتنی دیر میں آپ کے لئے ناشتہ تیار کر کے لے آئی ہوں۔“

”شیو کا سامان تو میرے پاس نہیں ہے؟ اور پھر مجھے ایک جوڑا لباس کا بھی چاہئے۔“ میں نے ہنکے سے اترتے ہوئے کہا۔

”یہ سب کچھ آپ کو غسل خانے میں مل جائے گا۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مین دبا کر مجھے بلا لیں۔“

وہ دروازہ کھول کر کمرے سے نکل گئی۔ میں چند لمحوں کے بعد دروازے کی طرف بڑھا تاکہ دروازہ کھول کر تو دیکھوں کہ یہ کوئی پرائیویٹ ہسپتال ہے یا مکان..... دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے غیر محسوس انداز سے اس پر گتے پنڈل کو گھمایا۔ پوری طرح حرکت دینے کے بعد اسے اپنی طرف کھینچا۔ دروازہ نہیں کھلا۔ وہ بند تھا اس نے دروازہ کس طرح بند کیا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ چابی گھومنے کی آواز بھی نہیں آئی۔ شاید باہر سے اس دروازے کو بند کرنے کا کوئی طریقہ تھا۔ میں نے دوایک مرتبہ دروازے کو اپنی طرف کھینچا مگر دروازہ نہیں کھلا۔ میں نے چابی کے سوراخ میں سے باہر جھانکا تو میرے بدن پر سسکی کی لہر دوڑ گئی ایک لال اور خفک آگے سوراخ میں سے جھانک کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

دروازہ نہ کھلنے کی وجہ میری سمجھ میں آگئی اور نرس نے میرے دوایک سوالوں کا جواب جو نمیل دیا اس کی وجہ بھی میں غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ غسل خانہ خاصا بڑا تھا اس میں ٹوائلٹ بھی تھا ایک طرف بیگنر میں سفید تولیہ اور ایک دھلا سفید جوڑا لٹکا تھا جہاں میں لگا تھا ہاں دیوار میں ایک آئینہ بھی تھا اور سینڈ میں شیوگ کریم، ریزر، بلینڈر کا ایک بیگٹ نمائے کا صابن اور آفٹر شیو لوشن بھی تھا۔ عمل میں گرم پانی آرہا تھا۔

میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ میری داڑھی کسی بچوں کی طرح بڑھی ہوئی تھی اور میرا حلیہ کسی فقیر کی طرح ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے شیو کیا تو میری اصل صورت نکل آئی اور میں نے اپنے سارے بدن میں جستی سی محسوس کی۔ جب میں نما کر اور کپڑے بدل کر کمرے میں آیا تو آواز نہ تھا اور مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ کبھی میں نے

دروازہ بند کر رہی تھی اس لئے میں اس کی شکل دیکھ نہیں سکا تھا۔ وہ دروازہ بند کرنے میری طرف گھومی تو میں نے اسے دیکھا اور ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔

وہ میں بائیں برس کی جوان لڑکی تھی۔ سانولی رنگت کی پرکشش لڑکی چہرہ اور متناسب بدن قدر دیمانہ تھا۔ وہ ٹرے لئے میری طرف بڑھی تو اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ تھی۔ سفید لباس میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی اس نے میرے قریب آکر ٹرے ساؤنڈ فیمل پر رکھ دی اور مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”صبح بخیر..... مسٹر سالار!“

”صبح بخیر.....“ میں نے جواب دیا۔ اس کی آواز بھی خوبصورت تھی میں نے ٹرے کی طرف دیکھا اس میں روٹی کے تین چار پیچھے اور ایک سرخ رنگ کی تھی۔ وہ مجھے انجشن لگانے آئی تھی۔ ”کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“

”میرا نام سرتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں یہاں نرس ہوں۔“

”کیا آپ یہ بتا سکتی ہیں کہ میں کہاں ہوں؟ یہ ہسپتال ہے یا گھر.....؟“

”یہ ہسپتال ہے اور آپ ہسپتال کے کمرے میں ہیں۔“ وہ ٹرے میں سے روٹی کا پھاپا اور سرخ اٹھائی ہوئی بولی۔

”یہ کون سا ہسپتال ہے اور کس جگہ پر واقع ہے۔“ میں نے اپنی فیض کی آستین بازو تک چڑھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

وہ سرخ کی سوئی سے پچھلے کو گلیا کرنے کے بعد میرے قریب آئی۔ اس نے پچھلے کو میرے بازو پر ملا اور پھر اس جگہ سوئی داخل کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ”آئی ایم ساری مسٹر سالار! میں آپ کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی.....“

”کیوں؟“ میں نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا آپ کو منع کیا گیا ہے؟“

”آپ بہت سمجھدار ہیں مسٹر سالار!“ اس نے دوسرے لمبے سرخ میرے بازو سے نکالتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا آپ یہ تو بتا سکتی ہیں کہ میں یہاں کب سے اور کتنے دنوں سے بے ہوش ہوں۔“

”جی.....“ اس نے روٹی کے اس پچھلے سے میرے بازو کو ملا اور ٹرے میں سرخ رکھ کر اسے اٹھالیا۔ ”تین دن پہلے آئے تھے اور اس روز سے آپ کو مسلسل بے ہوشی کے انجشن دے کر بے ہوش رکھا گیا۔“



”سینڈوچ آپ کے لئے اور کافی میرے لئے ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر دلی مسکراہٹ بھیل گئی۔ ”مجھے معلوم تھا کہ آپ میر نہیں ہوئے ہوں گے۔“  
 ”وہ کیسے؟“..... ”میں نے سینڈوچ کی پلیٹ ٹرے میں سے اٹھاتے ہوئے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”ایک صحت مند شکاری جو تین چار دن سے سخت بھوکا ہو اس کے لئے یہ ناشتہ کافی کیسے ہو سکتا ہے۔“

”میں شکاری نہیں بلکہ شکار ہوں۔“ میں نے کافی ٹانگ اٹھا کر اس کا گھونٹ حلق سے اتارا۔ کافی بہت اچھی تھی اور مزہ دے رہی تھی۔ وہ بھی کافی پینے لگی۔ میں نے اس کے قریب ہو کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ مجھے شکار کس لئے کیا گیا ہے؟“

اس نے جواب دینے سے پہلے دروازے کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھا۔ ”میں کچھ نہیں جانتی۔“

میں سمجھ گیا کہ اسے میرے سوال کا جواب دینے میں کون سی بات مانع ہے۔ میں نے اس کی طرف سینڈوچ کی پلیٹ بڑھائی۔ اس نے شکریہ کہہ کر لینے سے انکار کیا۔ پھر میرے اصرار پر ایک پیس اٹھایا۔ میں اس سے سوال پوچھنے کے خیال سے سینڈوچ کی پلیٹ پر جبک گیا۔ ”کیا اس جیل خانے میں اور بھی قیدی ہیں؟“.....

”جیل خانہ ہے تو اور بھی قیدی ہوں گے مگر آپ یہاں سے فرار ہونے کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ ایسے سوالات پوچھنے کی کوشش نہ کریں جو یہاں سے متعلق ہوں۔ میں نے آپ کی ایک بات کا بھی جواب دے دیا تو پھر آپ کی خدمت پر کسی مرد کو لگا دیا جائے گا۔“

اس کی بات سن کر میں نے اس سے مزید سوالات پوچھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا میری وجہ سے غریب کسی مصیبت کا شکار ہو جائے۔ میں اس سے آگے چل کر ناکندہ اٹھا سکتا تھا۔ وہ میرے فرار ہونے میں بڑی مدد کر سکتی تھی لیکن اتنی جلدی بھی نہیں۔ اس نے فرار نہ ہونے کے لئے جو کچھ کہا تھا اس میں میرے لئے ایک طرح سے اشارہ تھا۔  
 ”تھوڑی دیر کے بعد وہ برتن لے کر چلی گئی تو میں نے کھڑکی کے پاس جا کر باہر جھانکا۔ سامنے ایک عمارت کا عقیقی خاصہ نظر آ رہا تھا۔ ادھر کئی جگہ اور جھانپاں تھیں۔ ادنیٰ اور بائیں بھی جھانپاں سی نظر آ رہی تھیں۔ مگر اس کو سلاطاری تھا میں چند لمحوں تک کھڑا رہا

ایسی بھوک محسوس نہیں کی تھی۔  
 ”تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ سریتا ایک بڑی سی ٹرے لئے اندر داخل ہوئی۔ دروازہ جس شخص نے کھولا تھا اس پر میری نظر پڑی۔ وہ ایک بد صورت اور خوفناک چہرے کا شخص تھا۔ اس کی کمر میں ایک جینی ہتھی تھی اس میں پتول اور گولیاں نظر آ رہی تھیں۔ سریتا کے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے سریتا سے کہا۔ ”بڑا سخت پہرہ ہے۔ میں جیسے مریض نہیں قیدی ہوں۔“

سریتا کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”جی ہاں..... آپ اپنے آپ کو قیدی سمجھیں معزز مہمان نہیں۔“  
 اس نے ٹرے بستر پر رکھا تو میں نے ناشتہ کا جائزہ لیا۔ براہر تکلف ناشتہ تھا لیکن چائے نہیں تھی۔

”کیا ناشتہ بغیر چائے کے ہو گا.....؟“ میں نے سلاٹس اور چھری اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”میں چائے اس لئے نہیں لائی کہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ اس نے مسکرا کے جواب دیا۔ ”آپ کافی پیئیں گے یا چائے؟“

”کافی.....“ میں نے سلاٹس پر کھنکھن لگاتے ہوئے کہا۔ ”میرا تو قیدی کو بڑا شاندار ناشتہ دیا جاتا ہے۔“

”اچھا میں آپ کے لئے کافی بنا کر لے آتی ہوں۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی ہوئی۔ ”آپ کو نہ کہدہ خاص قیدی ہیں اس لئے آپ کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔“

میں چونکہ تین چار دن سے بھوکا بنا سا تھا اور پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے اس لئے میں ناشتہ پر کسی نذیر سے بچنے کی طرح ٹوٹ پڑا تھا۔ دس منٹ کے اندر اندر میں نے ناشتہ ایک طرح سے ہڑپ کر لیا۔ ٹرے پوری طرح صاف ہو چکی تھی۔ صرف جام جیلی کے علاوہ کوئی اور چیز رہی نہیں تھی اس قدر بڑھکلف ناشتہ بضم کرنے کے باوجود میری بھوک پوری طرح مٹی نہیں تھی۔ کچھ اور کھانے کو دل چاہ رہا تھا۔ سریتا چند دیر میں منٹ کے بعد دو کپ گرم گرم کافی اور سینڈوچ لے آئی تو میرا دل خوش ہو گیا۔

”یہ سینڈوچ کس کے لئے.....؟“ میں نے پوچھا۔ ”دو کپ کافی کیا میرے لئے؟“

میں یہ عزت و قدر تو انکے ہاتھوں سے دیکھے جاتے تھے اس لئے کہ غریب پر دہتے۔ غریبوں کی آنکھوں کا مفت آپریشن کرتے تھے۔ وہ دوسرے ڈاکٹروں کی طرح لالچ و فطرت کے نہ تھے۔ انسان دوست آدمی تھے۔

وہ میری کتاب کی رونمائی میں بھی آئے تھے۔ نجم التہار کے دور کے دہشتہ داروں میں تھے۔ وہ میرے بڑے قدر دان تھے اور ان کے پاس میری تقریباً تمام کتابیں بھی موجود تھیں۔ انہوں نے ابھی میری طرف دیکھا نہیں تھا وہ مجھے والے سے باتیں کر رہے تھے۔ میں انہیں یہاں دیکھ کر کہتے ہیں آگیا۔ میری حیرت بھری نظریں انہی پر مرکوز تھیں۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ ایک عظیم شخص کا تعلق ایک درندہ صفت انسان سے بھی ہو سکتا ہے۔

جب انہوں نے میری طرف دیکھا تو وہ بری طرح چونک پڑے۔ انہیں جیسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ وہ تجرذہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے اور میں دل میں سوچ رہا تھا کہ ان کا یہاں کیا کام.....؟ وہ کسی لے اس ظالم و جابر شخص کے ساتھ ہیں۔ جو انسانیت کی پیشانی پر ایک داغ ہے۔ میں ہلکے سے اتر کر فرش پر کھڑا ہوا تو وہ تیزی کے ساتھ میری طرف بڑھے اور مجھ سے بھٹکے ہو گئے۔

”سرمسار! آپ یہاں.....؟“ وہ حیرت کے لمحے میں بڑے زور سے بولے۔

”سرمسار! آپ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرو.....“

میں نے ان سے الگ ہو کر ان کی آنکھوں میں بھانکنا کہ ان کی اس بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کی زبان بھی مجھ سے یہی کہہ رہی تھی۔ ان کے چہرے پر ہلاکی و سجدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس جیسے والے شخص نے ہمارے پاس آکر کہا۔ ”اچھا تو آپ دونوں ایک دوسرے سے ذاتی طور پر بھی واقف ہیں۔ بہت خوب..... یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی۔“

دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک مسلح شخص نے اندر داخل ہو کر جیسے والے سے کہا۔ ”سرمسار! کالیونیون آیا ہے۔“

”میں ابھی بات کر کے آتا ہوں۔“ اس نے سرمسار اور ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔

”آپ دونوں ہمیں غمیریں۔“

وہ کمرے سے نکلا تو اس کے پیچھے مسلح شخص بھی چلا گیا۔ کمرے میں ہم تینوں رہ گئے۔ میں نے ڈاکٹر قدرت خدا سے پوچھا۔ ”سرمسار! یہاں کیسے.....؟ کیا آپ کا ان سے کوئی تعلق ہے؟“

یہ جگہ شر اور کسی گاؤں میں نہیں تھی۔ کسی جزیرے پر آباد معلوم ہوئی تھی۔ پھر میں نے ایک لالچ کے سازن کی آواز سنی جو بہت دور سے آ رہی تھی۔ اب یہ بات علم میں آچکی تھی کہ یہ گاؤں ہے اور ندی کے کنارے یا کسی دریا کے پاس واقع ہے۔

میرا ایک دن تو اس طرح گزر گیا۔ سرمسار کے سوا کوئی اور مجھ سے بات کرنے میری مزاج پر ہی کے لئے نہیں آیا۔ وہ میرے لئے کھانا چائے اور دوا کا کھانا لے کر آتی رہی۔ دوپہر اور دوا کا کھانا بھی بہت پر تکلف اور شاندار تھا۔ نہ بڑا ذائقہ دار تھا۔ میں حیران تھا کہ مجھے یہاں کیوں اور کس لئے لایا گیا ہے۔ آخر کوئی آدمی اگر مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا؟ مجھے کس مقصد کے لئے یہاں قید کیا گیا ہے۔

میرے پہلے چائے لکھنا اور ناشتہ سرمسار خود اپنے ہاتھوں سے پکا کر لاتی تھی۔ صبح وہ میرے لئے ناشتہ لے کر آتی۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ برتن لے جاتے وقت بولی۔ ”مسٹر سالار! تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر اور یہاں کے انچارج آپ کا معائنہ کرنے اور آپ سے ملنے کے لئے آئیں گے۔“

”کس بات کا معائنہ.....؟ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ میں انچارج سے بات کرنا پسند کروں گا۔“

”یہ بات تو آپ کو ڈاکٹر ہی بتائیں گے۔“ وہ بولی اور کمرے سے نکل گئی۔

کوئی چندہ منٹ کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا تو سب سے پہلے سرمسار داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی اس کے پیچھے ایک شخص چٹون قمیض اور دل میں لمبوس تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں تاریک شیشوں کی عینک سے چھپا رکھی تھیں۔ اس کے چہرے پر فریج کٹ داغ تھی اس کے چہرے سے جو سفاکی نمایاں تھی اس سے وہ درندہ صفت شخص لگ رہا تھا۔ میں سمجھا کہ یہ وہی خون آشام بھیڑیا ہے جو انسانوں کا شکار کرتا ہے۔ آدم خور ہے اس کے پیچھے پیچھے سفید انہی میں جو شخص داخل ہوا وہ ڈاکٹر تھا۔ ڈاکٹر کے پیچھے ایک مسلح شخص تھا وہ کسی پیشہ ور قاتل کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مجھے کینہ توڑ نگاہوں سے گھور رہا تھا اس کے ہاتھ میں یہ بدترین شین گن تھی وہ چونکا اور چوس تھا میں نے ایک لمحے کے لئے دل میں سوچا کہ کاش یہ شین گن میرے ہاتھ لگ جائے۔

ڈاکٹر کو دیکھتے ہی میں نے بچپن کیا۔ یہ ڈاکٹر سرجن قدرت خدا تھے۔ آنکھوں کے ماہر۔ بھگہ دیش میں ان کے پائے کا کوئی ڈاکٹر نہیں تھا اور ان کا شمار دنیا کے چند بڑے ڈاکٹروں میں ہوتا تھا۔ آج تک ان کے ہاتھ کا کوئی آپریشن ناکام نہیں ہوا تھا۔ بھگہ دیش

اوپر والا بجائے گا۔ دل چھوٹا نہ کرو۔ جو صلہ نہ بارو۔ اس کی ذات پر بھروسہ رکھو۔“  
 ”تو کیا آپ کو بھی یہاں اغوا کر کے لایا گیا ہے؟“ میں نے حیرت سے سر ہٹا سے پوچھا۔  
 ”آپ یہاں کب سے قید ہیں؟“

”ہی ہاں.....“ اس نے اپنا سر ہلایا۔ ”کوئی دو مہینے پہلے دس نرسوں کو سینٹ جان ہسپتال کے ہوٹل سے اس خوبصورتی اور مضبوط بندی سے اغوا کیا گیا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ ان دس نرسوں میں سے میں ایک ہوں۔ دوسرے دن اس ہسپتال سے دو ڈاکٹروں کو بھی اغوا کر کے یہاں پہنچا دیا گیا۔ ان میں سے دو نرسوں کو یہاں رکھ لیا گیا۔ باقی آٹھ نرسوں اور دو ڈاکٹروں کا کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟ ان کا کیا حال ہو؟ وہ زندہ ہیں یا مر گئے؟ یہاں صرف دو نرسیں ہیں جو قیدیوں سے بھی بدتر زندگی گزار رہی ہیں۔ ہم دونوں یہاں شرمناک زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس زندگی سے نجات پانا چاہتی ہیں مگر اس کوشش میں بھی ہم کامیاب نہ ہو سکیں۔ انہوں نے ہمیں ایک سال تک اس شرط پر قید رکھنا منظور کیا ہے کہ ہم ان کا دل بھلائی دیں۔ پھر ایک سال کے بعد ہمیں نہ صرف رہائی ملے گی بلکہ ایک کثیر رقم بھی دی جائے گی۔ اس بھولے وعدے پر ہم یہاں زندگی گزار رہی ہیں۔“ اس کی آواز بھرا سی تھی۔

”پھر مجھے تم چاہتی ہو کہ ایک شخص اپنے آپ کو ان دہندوں کے حوالے کر دے جن کے نزدیک انسانوں کی کوئی اہمیت نہیں، یہ سفاک دہندے اسے سسکا سسکا کر اس طرح مارویں کہ وہ اذیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے۔ کیا ایسا شخص ان کے وحشیانہ مظالم کا نشانہ بننے کے بجائے ان سے مقابلہ نہ کرے۔ صرف اپنی زندگی اور بقا کے لئے نہیں بلکہ تمہارے لئے ان بد نصیبوں کے لئے جو ایسے شخص کی قید میں ہیں جو انسان کے بھیس میں شیطان ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اس شیطان سے زندگی کی بھیک مانگیں گے تو زندگی کی بھیک مل جائے گی؟“ ڈاکٹر قدرت خدا کی سانس پھولنے لگی۔

”نہیک ہے ایک کو کوشش کر کے دیکھ لی جائے۔“ سریتا دھمکی ہوئی آواز میں بولی۔  
 ”میں مسٹر سالار کی کامیابی کے لئے دعا کروں گی۔“  
 ”تم زور کو مشت کرو اور جان پر کھیل جاؤ تو سالار کے فرار میں آسانی ہو جائے گی۔ پھر اس شیطان سے انسانوں کو نجات مل جائے گی۔“

”میں تو اپنی جان دینے کے لئے بھی تیار ہوں۔“ وہ دل گرفتہ لہجے میں کہنے لگی۔  
 ”اب میرے لئے زندگی میں کوئی کشش نہیں رہی اور نہ جینے کی کوئی انگ رہی ہے۔“

”کیا آپ کے خیال میں ایک ڈاکٹر ایک دہندہ صفت شخص یا تنظیم سے کسی قسم کا تعلق رکھ سکتا ہے؟“

”نہیں.....“ میں نے اپنا سر ہلایا۔ ”آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے دکھ اور حیرت ہوئی ہے۔ میں اناٹک دور کر رہا ہوں۔“  
 ”دو دن پہلے مجھے میری چٹا گنگ کی رابٹ گاڑے ایک ہفتے کے لئے اغوا کیا گیا ہے۔“ وہ جتانے لگے۔ ”اس تنظیم کے پاس نے مجھے ایک خاص مقصد کے لئے اغوا کیا ہے۔ اس کا مقصد ایک نیا تجربہ کرنا ہے۔“

”کیسا تجربہ.....؟“ میں نے تجب سے ان کی طرف دیکھا۔ ”وہ آنکھوں کے ماہر سے کس قسم کا تجربہ کرانا چاہتا ہے۔“  
 ”پلیز ڈاکٹر.....“ سریتا نے انہیں ٹوکا۔ ”آپ مسٹر سالار کو کچھ نہ بتائیں۔ مسٹر جعفر غصہ ہو جائیں گے۔“

”یہ مسٹر جعفر کون ہے؟“ میں نے سریتا کی طرف دیکھا۔ ”کیا تمہارے پاس کا نام جعفر ہے؟“

”مسٹر جعفر اس علاقے کے انجارج ہیں۔“ سریتا بولی۔ ”ہمارے ساتھ آئے تھے اور اب باس کا بیلیفون سننے کے لئے گئے ہیں ان کا نام جعفر ہے۔ وہ بہت سخت مزاج آدمی ہیں۔ ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو تو وہ انہیں سخت مزاحیہ ہیں۔“  
 ”دیکھو نرس! ڈاکٹر قدرت خدا نے اس سے کہا۔“ میرے خیال میں یہ سہرا موقع ہے کہ میں اپنے دوست کو تمام باتیں بتا دوں تاکہ یہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کریں۔ اس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ کیا معلوم اس شخص کی وجہ سے ہمیں اس ظالم کی قید سے نجات مل جائے۔“

”جہاں چڑیا پر نہیں مار سکتی ہو کیا وہاں سے فرار ممکن ہے؟ جہاں قدم قدم پر دہندے پہرہ دے رہے ہوں وہاں کوئی صورت کیسے ہو سکتی ہے۔ یہاں تو ہر لمحہ موت کا خطرہ ہے۔ نہیں..... ڈاکٹر نہیں..... یہاں سے فرار ہونا ناممکن ہے۔ فرار ہونے کی کوشش کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔“ وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ ”میں تو خدا کی ذات سے بھی ناامید ہو گئی ہوں۔“

”انسان کو خدا کی ذات سے آخری سانس تک ناامید نہیں ہونا چاہیے۔“ ڈاکٹر قدرت خدا نے نرس کے پاس جا کر اس کا شانہ چھتہ تپایا۔ ”ہمیں اس حیثیت کی ذات سے

”تم اپنی کوشش جاری رکھنا اور میں دو ایک دن کسی نہ کسی بہانے سے آپریشن ٹالتا رہوں گا۔ ادھر مسٹر سلا ر کوئی منصوبہ بنالیں گے۔“

”کیسا آپریشن.....؟ کس کا آپریشن.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”آپ کا آپریشن.....“ ڈاکٹر قدرت خدا نے جواب دیا۔ ”یہ درندہ صفت شخص جس کی صورت میں سے بھی نہیں دیکھی وہ ایک نیا تجربہ کرنا چاہتا ہے۔ اس تجربے کے لئے اس نے میرا اغوا کیا۔ اس تنظیم کے آدمی نے مجھے بتایا کہ ان کا پاس ہر سال کوئی نہ کوئی نیا تجربہ انسانوں پر کرتا ہے۔ خاص کر شکاریوں پر۔ اس کے نزدیک یہ ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔“

”میرا کس چیز کا آپریشن کرنا چاہتا ہے وہ.....؟“ میرا دل دھڑکنے لگا۔

”آنکھوں کا.....“ ڈاکٹر قدرت خدا نے بتایا۔

”آنکھوں کا.....؟ میری آنکھیں تو اچھی بھلی ہیں۔ وہ میری آنکھوں کا آپریشن کروا کے کیا کرے گا؟“  
 ”وہ آپ کی آنکھیں نکال کر اس کی جگہ شیر کی آنکھیں لگانا چاہتا ہے۔ شیر کی آنکھوں میں آپ کی آنکھیں.....“

”کیا.....؟“ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میرے جسم میں ابو عرف کی طرح سرد ہونے لگا۔

”وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ایک انسان کو شیر کی آنکھیں مل جائیں تو اسے کیسا لگے گا اور اس میں کیا تبدیلی رونما ہوگی۔ کیا رد عمل ظاہر ہوگا۔ اس طرح سے وہ شیر کے بارے میں جانتا چاہتا ہے۔ اس تجربے کے لئے اس نے آپ کا انتخاب کیا ہے۔“  
 ”یہ تو کوئی فسطی اور پاگل معلوم ہوتا ہے۔“ میرے حلق میں آواز پھنسنے لگی۔  
 ”اس تجربے سے اسے کیا حاصل ہوگا؟“

”آپ سچ کہتے ہیں۔“ سریتانے میری تائید کی۔ ”یہ میاں جو ہسپتال ہے اس میں نت نئے تجربے کئے جاتے ہیں۔“

”کیسے تجربے.....؟“ ڈاکٹر قدرت خدا نے سریتا کی طرف حیرت سے دیکھا۔  
 ”کیا میاں اور بھی ڈاکٹر اور سرجن ہیں؟“

”کوئی ایک تجربہ ہو تو بتاؤں۔“ وہ کہنے لگی۔ ”بہی تو کسی انسان کا دماغ کسی خوفناک جانور سے بدل دیا جاتا ہے تو تبھی کسی مرد کا دل کسی عورت کے دل سے..... میاں دو

تین سرجن ہیں جو یہ آپریشن کرتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر بھی میاں قیدیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔“

”کیا یہ آپریشن کامیاب ثابت ہوئے ہیں.....؟“ ڈاکٹر قدرت خدا کے چہرے پر گہرا استغاب چھا گیا۔

”بہت کم آپریشن کامیاب ہوئے ہیں۔“ سریتانے بتایا۔ ”ان لوگوں کا آپریشن کرنے کے دو تین دن کے بعد انہیں میاں سے ایک جزیرے پر لے جایا جاتا ہے۔ اس جزیرے پر ان کا پاس رہتا ہے اور وہ وہیں سے حکومت کرتا ہے۔“

”جزیرہ.....؟“ میں چونکا۔ ”کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ جزیرہ کہاں واقع ہے؟“

”نہیں.....“ سریتانے سر ہلایا۔ ”میں نے کبھی جاننے اور کسی سے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر آپ کو اس جزیرے کا پتا چل بھی گیا تو آپ کیا کریں گے؟“  
 ”سنا ہے کہ اس جزیرے پر ہر کوئی پہنچ نہیں سکتا۔ غلطی سے کوئی پہنچ گیا تو واپس نہیں آسکتا۔ اس جزیرے کے بارے میں سنا ہے کہ اس گاؤں سے کہیں خوفناک اور ہراسنا رہا ہے۔ وہ ایک ظلم ہے۔ اس جزیرے پر ایک درندہ صفت انسان کی حکمرانی ہے۔“

”اس جزیرے کا پتا چل جائے تو ایک ہی دن میں نہ صرف اس خبیث سے نجات مل سکتی ہے بلکہ سیکڑوں کو رہائی بھی۔ اس شیطان نے درندگی کی حد کر رکھی ہے۔ وہ نت نئے مظالم کو تجربات کا نام دے کر انسانیت کے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔“ میری نرس نرس میں اٹھنے لگی۔

”کیا اس گاؤں میں ایسا آپریشن تعمیر اور آلات جراثیم ہیں کہ اس قسم کے آپریشن اور تجربات کئے جاسکیں؟“

”سریتا آپریشن تعمیر کے بارے میں کچھ کہنے والی تھی کہ کرب کے باہر آدرازیں سنائی دیں۔“ جعفر اپنے مسلخ گارڈ کے ساتھ اس کمرے کی طرف تیزی سے آ رہا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ ڈاکٹر قدرت خدا نے میرے قریب آکر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”مسٹر سلا ر! جتنا جلد ہو سکے آپ میاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنائیں۔ خدا آپ کی مدد کرے۔ میاں سے نجات پانے کے بعد انسانیت کو اس شیطان سے نجات دلائیں۔“

”کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔“ جعفر اپنے مسلخ گارڈ کے ساتھ اندر داخل ہوا تو اس کا پتا اور رہے راحم چہرہ کسی خیال سے دکھ رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر قدرت خدا کے پاس

آکھوں کی تبدیلی کا آپریشن ہو گا۔ پھر آپ کو اس جگرے میں اس چپے کے ساتھ قید کر دیا جائے گا جو آپ کی آنکھوں کا مالک ہو گا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اس چپے کا کیا رد عمل ہوتا ہے؟ آپ اسے جبراً ڈرکھاتے ہیں یا وہ..... ہم اس کی ایک ویڈیو فلم بھی بنائیں گے۔“

”ایک ذلیل اور کمینہ خصلت آدمی اس کے علاوہ سوچ بھی کیا سکتا ہے؟ تم آدمی نہیں درندہ ہو۔“ میں نے خٹنگا ہوں سے گھورا۔

”اگر میرے پاس آپ کے لئے خاص ہدایات نہیں ہوتیں تو میں آپ کو ابھی مزہ چکھا دیتا۔ بریف آپ مجھے غصہ نہ دلائیں۔ میرا دماغ گھوم گیا تو میرا آدمی آپ کے چہرے کا جغرافیہ ایسا تبدیل کر دے گا کہ آپ اپنے آپ کو کبھی پہچان نہیں پائیں گے۔“

فضائیں تنگی پر مبنی دیکھ کر ڈاکٹر قدرت خدا ہم دونوں کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ ”پلیز! بات مت بولنا۔“ چہرہ جعفری کی طرف گھوم کر بولے۔ ”کیا آپ اپنے ہسپتال کے آپریشن تھیمپل کے بارے میں کچھ تائید فرمائیں گے؟“

”آپ آپریشن تھیمپل کے بارے میں کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“ جعفری اپنا غصہ فرو کرتے ہوئے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا آپریشن تھیمپل اور آلات جراثیم ایسے ہیں کہ آنکھوں کی تبدیلی کا آپریشن ہو سکے؟“

”آپریشن تھیمپل.....؟“ اس کے ہونٹوں پر مبنی خیر مسکراہٹ بھیل گئی۔ ”میرا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے جیسا آپریشن تھیمپل اور آلات جراثیم پورے جنگہ دیش میں نوکیا، ہندوستان اور پاکستان میں بھی نہیں ہوں گے۔ سارا سامان خاص طور پر مغربی جرمنی سے منگوا گیا ہے۔ یہ سب کچھ جدید ترین اور نیا ہے۔ آپ دیکھیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔ آپ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔“

”آخر اس کی کیا ضرورت تھی؟ اس پر لاکھوں ٹاکا پانی کی طرح کیوں برباد کیا؟ آخر آپ کا پاس اس سے کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟“

”یہ میرے پاس کا شوق ہے۔“ وہ بولا۔ ”وہ بھی ایک سرجن ہیں، کروڑ پتی آدمی ہیں، ان کی اپنی مرضی وہ جیسا اور کس طرح چاہیں خرچ کریں..... دولت ہوتی کس لئے ہے؟ خرچ کرنے کے لئے۔ یہ ان کی اپنی دولت ہے وہ جس طرح چاہیں خرچ کریں ہم کون کون سے اور شور مچانے والے۔“

جا کر بولا تو اس کے لمبے میں ایک عجیب سی سرشاری تھی۔ ”میرے پاس کالینین آیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ شیر کے بجائے ایک خوفناک قسم کا چیتا ہاتھ لگا ہے۔ وہ حد سے زیادہ خطرناک ہے۔ میرے پاس کا یہ خیال ہے کہ چپے کی آنکھوں کا آپریشن زیادہ بہتر رہے گا۔ یوں بھی اس کی آنکھیں خوبصورت، تیز اور بے حد پتیلی ہوتی ہیں۔ کیوں.....؟“

”اگر آپ میرا خیال پوچھتے ہیں تو میں یہ کون گا کہ یہ آپریشن نہیں بلکہ ایک معصوم اور بے گناہ انسان کے ساتھ درندگی کا بدترین مظاہرہ ہے۔ برہمیت ہے..... انسانیت کے ساتھ ایک ہمایک مذاق ہے مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کا پاس کوئی فحشی انسان ہے۔“ وہ زہر خند لیے ہوئے۔

”ڈاکٹر! آپ جذباتی ہو رہے ہیں۔“ وہ ہنسا اس کا چہرہ اور کردار دکھائی دینے لگا۔ ”آپ ذرا غصہ سے دل اور سر خیر ہو جائیں۔ کیا یہ ایک ایسا سنسنی خیز اور دلچسپ تجربہ نہیں ہے جو دنیا میں آج تک کسی نے نہیں کیا؟ میرا پاس ایک ایسا تجربہ کر رہا ہے جس سے نہ صرف انسانیت بلکہ ساری دنیا کو فائدہ پہنچے گا۔ طب کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب آئے گا۔ میرے پاس اور مسٹر سالار کا نام تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔“

”اگر آپ بھی اپنی آنکھوں کی تبدیلی کا آپریشن کسی سواری آنکھوں سے کرائیں تو یہ تجربہ اپنی مثال آپ ہو گا۔“ میں نے طنز سے لہجے میں کہا۔

”مسٹر سالار! میری بات سن کر اس کے چہرے پر تازہ پیدا ہو گیا۔“ آپ زبان سنہال کر بات کریں۔“

”اس مشورہ کا بار کیوں مان رہے ہیں آپ؟ کیا سواری آنکھیں خوبصورت نہیں ہوتیں؟ یوں بھی آپ کسی سواری سے کس نہیں لگ رہے۔“

”مسٹر سالار! اس نے غصے سے فرش پر پیر پھا۔“ اگر آپ نے مزید بکواس کی تو آپ کی زبان سمجھ لوں گا.....“

”کیا یہ بھی ایک نیا تجربہ ہو گا؟“ میں اسے اشتعال دلا رہا تھا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ مسلح بد معاش میرے پاس مجھے خاموش کرانے کے خیال سے آئے تو میں اس کی شین گن چھین لوں۔ یہاں سے نکلنے کے لئے ایک ایسی ہی شین گن کی ضرورت تھی۔

”نیا تجربہ.....؟ تجربات تو آپ پر کئے جائیں گے۔“ وہ غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔ ”پہلے تو آپ کو گولیاں کیا جائیں گی۔ اس کے بعد ہرا بنادیا جائے گا۔ پھر آپ کی



تبدیلی کے آپریشن کے خوف سے.....  
پھر میں کمرے میں ٹھٹھا ہوا فرا کے منصوبے کے بارے میں سوچنے لگا۔ ایسی کوئی  
مدہبر جو میں اس جہنم سے نکل سکوں۔ اس سوچ میں نصف گھنٹہ گزر گیا۔ سریتا میرے لئے  
کافی لے آئی۔ وہ آئی تو بڑی پریشان سی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے غر مند  
جھانک رہی تھی۔

”کیا بات ہے آپ بہت پریشان نظر آ رہی ہیں؟ خیریت تو ہے؟“ میں نے اس کے  
چہرے پر نظریں مرکوز کر کے پوچھا۔

”جی خیریت ہی تو نہیں ہے۔“ سریتا نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ”میری ساتھی  
نرس پارو ہے۔ اسے اس جڑ پر بے ہیمیا جا رہا ہے جہاں اس تنظیم کا ہیڈ  
کوارٹر ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں یہاں اکیلی رہ جاؤں گی۔“

”پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں سریتا!“ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”میں  
آپ کو یہاں رہنے نہیں دوں گا، فرار ہوتے وقت آپ کو بھی ساتھ لیتا جاؤں گا، اس کے  
لئے حوصلے اور مدد کی ضرورت ہے۔“

”ج!“ ایک لمحے کے لئے اس کا چہرہ دمک کر بھگ سا گیا۔ ”کیا کامیابی کی کوئی امید  
ہے؟“

”کو شش کرنا ہمارا کام ہے، باقی کام اللہ کا ہے۔ اللہ نے جہاں تو ہم اپنی کوشش میں  
کامیاب ہو جائیں گے۔“

”کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ..... ہم اس بے چاری پارو کو بھی اپنے ساتھ لے  
لیں۔“ اس کے چہرے پر ایک گھٹاسی جھانکائی اور آنکھوں میں اداسی گہری ہو گئی۔ ”وہ  
غریب اپنے گھروالوں کو یاد کر کے رات دن تڑپ رہتی ہے۔“

”یہ ایک فطری بات ہے۔ کیا آپ کو اپنے گھروالے یاد نہیں آتے؟“  
”کیوں نہیں یاد آتے.....؟“ وہ ساہمہ لہجے میں کہنے لگی۔ ”میری بیوہ ماں،  
میرے دو چھوٹے بھائی اور ایک بڑی بہن ہے۔ میری بہن کی شادی ہونے والی تھی۔  
برسوں کے بعد ہمارے گھر میں ہمارا آ رہی تھی۔ خوشی کے دن آ رہے تھے۔ اب تو وہاں  
میری گمشدگی سے ایک قیامت آگئی ہو گی۔ ساری خوشیاں ملیا میٹ ہوئی ہوں گی۔ میری  
ماں اور بہن کا رور کر رہا حال ہو گیا ہو گا.....“

اس کی آواز بھرا گئی اس کی آنکھوں میں موتی دسکنے لگے تو اس نے اپنی بات

”یہ دولت بھگدیش کے غریب لوگوں پر بھی تو خرچ کی جا سکتی ہے جنہیں ایک وقت  
کی روٹی بھی نصیب نہیں ہے۔“

”وہ غریبوں ہی پر تو خرچ کر رہے ہیں؟“ وہ سختی لہجے میں بولا۔ ”میں آپ کو کسی  
وقت بتاؤں گا کہ غریبوں کی کس طرح مدد کی جا رہی ہے۔“

”مجھے آپریشن کے لئے دو ڈاکٹروں اور نرسوں کی ضرورت پڑے گی جو.....“  
ڈاکٹر قدرت خدا نے کہا تو وہ درمیان میں بولا۔ ”آپ اس کی فکر نہ کریں آپ کو جن  
لوگوں کی جس چیز کی ضرورت ہے وہ حاضر کردی جائیں گی۔“

”تو کیا آپ مجھے آپریشن تعمیر کھائیں گے.....؟ میں ابھی دیکھنا چاہتا ہوں۔“  
وہ بولے۔

”کیوں نہیں..... چلے۔“ جعفر دروازے کی طرف گھوم گیا۔  
وہ باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھے تو سریتا ان سب کے پیچھے تھی۔ میں  
نے اس کا بازو پکڑ کے آنکھوں سے رکنے کا اشارہ کیا اس نے میرے قریب آ کر آہستہ سے  
کہا۔ ”میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“ پھر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

میں ہنگامے کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھا تو میرے شہم میں جیسے جان ہی نہیں رہی  
تھی۔ اس خیال سے میرا دماغ سنسنار ہوا تھا کہ میری آنکھوں کی تبدیلی کا آپریشن ہو گا۔  
میری آنکھیں نکال کر ان کی جگہ چیتے کی آنکھیں لگادی جائیں گی اور میری آنکھیں اس  
درندے کو۔ اگر میں یہاں سے فرار نہیں ہوا تو میرا حشر بڑا بھانک ہو گا۔ صرف یہی نہیں  
مجھے ہراساں کر دیا بلکہ مجھے بے خبری سے منہ بند کر دیا جائے گا تاکہ وہ درندہ  
مجھے چیر بھاڑ کے کمالے۔

اس لرزہ خیز آپریشن سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی وہ یہ کہ میں یہاں سے فرار ہو  
جاؤں۔ اس چیتے کے چبھنے میں دو ایک دن کی دیر تھی۔ میرے پاس دو دن تھے جن کا ایک  
ایک لمحہ میرے لئے بے حد قیمتی تھا۔ ان دو دنوں میں مجھے یہاں سے کسی بھی قیمت پر فرار  
ہونا تھا اسی صورت میں میری جان بھی بچ سکتی تھی۔ فرار کا منصوبہ سریتا کے تعاون کے بغیر  
نہیں بن سکتا تھا۔ سریتا نے اپنی طرف سے مدد کا یقین تو دلایا تھا مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا  
تھا اور اس گاؤں کے محل وقوع کے بارے میں بھی معلوم کرنا تھا۔ سریتا سے ایک آس سی  
بندھ گئی تھی۔ سریتا نے کل مجھے کچھ نہیں بتایا تھا اور میرے بہت سارے سوالوں کا جواب  
نہیں دیا تھا۔ آج اس کے خیالات میں تبدیلی آئی تھی۔ شاید ڈاکٹر یا میری آنکھوں کے

صورت تو نکل آئی تھی۔ میں نے یہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب صبح کا انتظار تھا۔ اس نقشے اور تفصیلات کا انتظار تھا جو سرتیانے کر آنے والی تھی۔ میں ان کی مدد سے منصوبہ بنا سکتا تھا۔

میں رات چار بجے تک سو نہیں سکا۔ میرے ذہن میں کتنے ہی منصوبے آرہے تھے۔ ان خیالوں نے مجھے سوئے نہیں دیا۔ میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ سرتیانے مجھے بیدار کیا۔ وہ میرے لئے بیڈنی لے کر آئی تھی۔ وہ بیڈنی دے کر چلی گئی۔ اس نے مجھ سے زیادہ بات نہیں کی۔ اس نے اشارے سے بتایا تھا کہ ایک پھرے دار دروازے کے باہر کھڑا ہے اور دروازے سے کان لگائے ہوئے ہے۔

میں شیوہ کر کے نما کے فارغ ہوا تھا کہ سرتیانے میں ناشتے لے آئی۔ ناشتے کی مقدار دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بھی میرے ساتھ ناشتہ کرے گی۔ جب اس نے ٹینک میں میری طرف بڑھایا تو اس کے اندر ایک کانڈہ تھا جو کیا ہوا تھا۔ میں نے وہ کانڈہ اٹھا کر جب میں رکھ لیا۔ سرتیانے دہلی زبان میں بتایا کہ یہ نقشہ اور ساری تفصیلات پارونے ساری رات جاگ کر بتائی ہیں۔ وہ ایک بل کے لئے بھی نہیں سوئی۔ سرتیانے ناشتے کے اختتام پر کہا۔ ”خدا کرے یہاں ہمارا آخری ناشتہ ہو!“

”آمین.....“ میرے دل کی اقامت گہرائیوں سے آواز نکلی۔

☆-----☆-----☆

وہ کافی بنانے کے لئے برتن اٹھا کر چلی گئی تو میں نے غسل خانے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے تمہ کیا ہوا کانڈہ کھولا۔ کانڈہ کے ایک طرف نقشہ تھا جو اٹھا۔ یہ نقشہ کم ایک طرح کی پینٹنگ تھی۔ وہ مصور معلوم ہوتی تھی۔ یہ گاؤں جزیرہ ہوا تھا۔ اس کے اطراف پانی تھا۔ یہ گاؤں درختوں میں گھرا ہوا تھا اور دروازے غیر آباد دکھائی دیتا تھا۔ یہاں پانچ عمارتیں تھیں۔ ایک عمارت جہتھال کی تھی، دوسری عمارت آپریشن ٹھیکری۔ تیسری عمارت میں اسلحہ اور دوسری چیزوں کا سٹور تھا۔ چوتھی عمارت میں پھرے داروں اور ملازمین کی رہائش گاہ تھی۔ پانچویں عمارت جو ایک منزلہ تھی اس میں جعفری رہائش گاہ اور دفتر بھی تھا۔ یہ تمام عمارتیں درختوں کے درمیان اس طرح سے گھری ہوئی تھیں کہ کسی طرف سے گاؤں سے باہر سے دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ یہ تمام عمارتیں ایک دوسرے سے قریب قریب تھیں۔

کانڈہ کے دوسری طرف جو تفصیلات لانچ اور آدمیوں کے بارے میں لکھی ہوئی

ادھر دیکھو زدی۔ وہ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھے گئی۔ پھر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”میں بھی اپنے گھر والوں کو یاد کر کے خوب روتی ہوں۔ میں تو اب ان سے ناامید ہو گئی ہوں کہ ان سے ملنا بھی نصیب ہو گا۔ یہاں کے آدمی اور پھرے دار بتاتے ہیں کہ..... یہاں جو بد نصیب ایک بار آگیا وہ واپس جانے کے بارے میں سوچے بھی نہیں۔

اب وہ یہاں سے سیدھا قبری میں جانے لگا۔“

”اب رونے کے بجائے ایک ہتھول یا ریو الور کیس سے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اس سے فرار میں آسانی ہوگی۔“

وہ سوچنے لگی۔ پھر اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ ”نہ صرف ریو الور بلکہ چاقو کا بھی بندوبست ہو سکتا ہے۔“

”دیر نی ٹلے.....“ میں نے اس کا شانہ چیتھپٹایا۔ ”مجھے اس گاؤں کے محل وقوع کے علاوہ یہ معلوم کرنا ہے کہ یہاں کل کتنے پھرے دار ہیں۔ کہاں کہاں ہوتے ہیں۔ کتنی لٹا انجیں، گاڑیاں اور موٹر بولس ہوتی ہیں۔ جعفری رہائش گاہ کہاں ہے۔ کتنے ٹیلی فون ہیں۔ یہاں لوگ دن میں آتے ہیں یا رات میں..... کیا یہاں قریب سے لائچیں اور سٹیئر بھی گزرتے ہیں؟“

”میں یہ ساری تفصیلات آپ کو ایک کانڈہ پر لکھ کر صبح تک پہنچا دوں گی۔ یہ ناشتے کے ساتھ ساتھ آجائیں گی۔“

”اب مجھے اندر سے میں امید کی کرن پیدا ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اس خوشی میں کیا گرم گرم کافی نہیں پلاؤ گی؟ یہ تو معصنری ہو گئی ہے۔“

وہ رات کا کھانا لے کر آئی توڑنے میں ایک ریو الور اور تیس چالیس گولیاں بھی ساتھ لیتی آئی۔ ایک خوفناک قسم کا چاقو بھی اس کے پاس تھا جو وہ اپنے کپڑوں میں چھپا کر لائی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ چاقو اور ریو الور وہ اسلحہ کے سٹور سے لے کر آئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں پارو کی وجہ سے حاصل ہو سکی ہیں۔ پھر وہ رکی نہیں فوراً واپس چلی گئی اس لئے کہ پارونے اس سٹور کے پھرے دار کو اپنے کمرے میں بلا کر روکا ہوا تھا اور اس کا دل بھلا رہی تھی۔ سرتیانے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ دونوں چیزیں سٹور سے اڑائی تھیں۔

میں نے دونوں چیزیں بستر کے نیچے رکھ دیں۔ ان دونوں چیزوں کو پاکر میری خوشی کی انتہاء نہ رہی تھی۔ مجھ پر ایک عجیب سی سرشاری طاری ہو گئی تھی۔ میری کس کس میں خون جیسے رقص کرنے لگا تھا۔ میری مشکل کسی حد تک آسان ہو گئی۔ یہاں سے نجات پانے کی

”وہاں میرے اور ڈاکٹر کے علاوہ تو دونوں کا موجود ہونا بھی ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ ہم اس وقت وہاں سے فرار ہوں گے۔“  
 ”وہ کیسے؟“ اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اس کا چہرہ دھکنے لگا۔ ”کیا یہ ممکن ہے؟“

”دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”میرے ذہن میں جو تدبیر آئی ہے اس کی کامیابی کے سو فیصد امکانات ہیں اور خدا کی ذات سے پوری پوری امید ہے کہ آج ہم ان درد مندوں سے نجات پالیں گے۔ آج کا دن ہمارا میاں آخری دن ہے۔“  
 سرتا دو پہر کا کھانا لے کر آئی تو اس نے بتایا کہ جعفر سے کوئی بات نہ ہو سکی اس لئے آج صبح جو لالچ سامان لے کر آئی اس میں تین جوان اور حسین لڑکیاں دو جوان مرد بھی تھے۔ ان تین لڑکیوں کو تو اس نے اپنے بند روم میں بند کر دیا۔ ان جوان مردوں نے ہل بازی کی تو انہیں پتھر سے مار مار کر ادھ موار کر دیا وہ درودہ زخمی حالت میں اس کے دفتر کے برآمدے میں بے ہوش پڑے ہیں۔ جعفر کا دماغ غصے سے بری طرح کھول رہا تھا اس لئے اس نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ سر پہرے کے وقت وہ شراب پیتا ہے اور بڑے موڈ میں ہوتا ہے تب وہ جعفر سے بات کر کے دیکھے گی۔

میں نے نمیک چار بجے لباس تبدیل کیا۔ جو تے پہنے ریلو اور چاقو کو الگ الگ جیب میں رکھ لیا۔ پھر بیٹے جینی سے سرتا کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی نصف گھنٹے کے بعد دروازہ کھلا تو دروازے پر دو مسلح بد معاش خود خوار کتوں کی طرح کھڑے تھے۔  
 ”چلو نکلو۔“ ان میں سے ایک نے اپنی سین گن میری طرف تانتے ہوئے کہا۔  
 ”صاحب نے تمہیں بلایا ہے۔“

ان کے ساتھ سرتا کو نہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں کوئی گزیر تو نہیں ہو گئی ہے۔ وسوسوں اور اندیشوں کے زہریلے سانپ مجھے جیسے ڈسنے لگے۔ شاید ان درد مندوں کو فرار کے منصوبے کی خبر ہو گئی ہے۔..... مگر کس طرح سے خبر ہو سکتی ہے؟ کس نے اس راز کو افشا کیا ہو گا کہیں سرتا نے تو نہیں..... کہیں سرتا اس مردود کی کھنکھلی تو نہیں..... اس کے اشارے پر اس نے کوئی چال تو نہیں چلی..... بیگم جمال کی طرح اس نے میرے ساتھ کوئی فریب تو نہیں کیا.....؟ فریب کرنا ہو تا تو وہ ریلو اور چاقو لائے دیتی اور پھر یہ دونوں بد معاش میری جامہ تلاشی لیتے۔ انہوں نے کوئی تلاشی نہیں لی صرف چلنے کے لئے کہا ہے۔

قصص وہ یہ تھیں۔ جعفر اور اس کے ساتھیوں سمیت بارہ آدمی تھے۔ ان میں چھ تو مختلف جنگوں پر پہرہ دیتے تھے۔ ایک سنور پر مامور تھا۔ دو آدمی ہسپتال کے اندر اور باہر پہرہ دیتے تھے۔ دو باورچی تھے۔ ایک خطرناک قسم کا بد معاش ہر وقت جعفر کے ساتھ رہتا تھا۔ پارونے اس کے بارے میں لکھا تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ پانچ اور خبیث شخص نہیں دیکھا۔

ہسپتال کے دو مختلف کمروں میں ’میں اور ڈاکٹر قدرت خدا عقیدہ تھے۔ یہاں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ ایک تیز رفتار اور جدید ترین لالچ تھی۔ اس کے علاوہ ایک دو موٹر بوٹ بھی تھیں جو سنور روم میں رکھی ہوئی تھیں۔ دو دن بعد ایک کارگو لالچ بہت سارا ضرورت کا سامان لے کر صبح دس اور گیارہ بجے آتی تھی۔ اس لالچ میں ان لوگوں کو لایا جاتا تھا جو عسکار ہو جاتے تھے اڈولڈس لالچ کے ذریعے یہاں سے قیدیوں اور مریمضوں کو جزیرے پر منتقل کیا جاتا تھا۔ ہراس راستے پر جو بندی کے کنارے کی طرف جاتا تھا مسلح بد معاش سخت پہرہ دیتے تھے۔

سرتا کافی لے کر آئی تو وہ میرا سفاری سوٹ بھی لے آئی جو وحلا اور استری کیا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”آپ کے ذہن میں کوئی تدبیر آئی؟“  
 ”میرے ذہن میں ایک تدبیر تو آ رہی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کیا ایسی کوئی صورت ممکن نہیں ہے کہ میں جعفر کے دفتر میں اس سے ملاقات کروں۔“  
 ”جعفر سے آپ دفتر میں مل کر کیا کریں گے؟ آپ کو وہاں ایک اور خبیثت سے واسطہ پڑے گا جس کا نام بندو ہے۔ پارونے اس درد مندے کے بارے میں اس کاغذ پر لکھا ہے۔ یہ درد مندوں کی بستی ہے جہاں ایک آدمی کا سانس لینا بھی دشوار ہے۔“  
 ”میں چوں کہ بہت کچھ کر سکتا ہوں اس لئے اس کے دفتر میں ملنا چاہتا ہوں۔ وہاں دس درد مندے بھی ہوں تو میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔“

”جعفر شاید شام کے وقت آپ سے اور ڈاکٹر سے ملنے کے لئے یہاں آئے۔ کیا اس وقت آپ کچھ نہیں کر سکتے؟“

”نہیں.....“ میں نے سر ہلایا۔ ”تم کو مشن کرو کہ شام کے وقت میں کسی نہ کسی بہانے سے وہاں طلب کیا جاؤں۔“

”میں کو مشن کر کے دیکھتی ہوں پارو سے مشورہ کر کے کوئی تدبیر لڑاتی ہوں۔“ وہ بوجھتی ہوئی بولی۔

انمول ہوتی ہے میں چاروں طرف دیکھنے لگا ایک بد معاش لپک کر میرے آگے آیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلنے لگا۔ میں غیر محسوس انداز سے جائزہ لیتا ہوا جا رہا تھا میں نے ندی کو بھی دیکھ لیا تھا جو سبک خرام تھی۔ بارو نے یہاں کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ کسی کبرے سے لی ہوئی تصویر کی طرح تھا۔ میں راستوں کو ذہن میں نقش کرتا جا رہا تھا مجھے وہ لالچ بھی کھڑی نظر آئی جو تیز رفتار دوا دہید تر بن تھی۔

درختوں کے درمیان گھری ہوئی اس غارت اور ہمارے درمیان فاصلہ کم ہو تا جا رہا تھا جو جغفر کا دفتر اور پائش گاہ بھی تھی، میں نے دل میں سوچا کہ ضرور کوئی ایسی بات ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ہم دونوں کو طلب کیا گیا ہے اور اس بد معاشی نے ہم دونوں کے ساتھ ذلالت آمیز سلوک کیا ہے۔ میں نے اندر ہی اندر ہر قسم کے حالات سے مقابلہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا مجھے ایک طرح سے اطمینان تھا کہ میرے پاس رپوالہ اور چاقو ہے جس سے میں نہ صرف اپنا دفاع کر سکتا ہوں بلکہ دشمن سے لڑ بھی سکتا ہوں۔

ڈاکٹر قدرت خدا کے چہرے پر کچھ ایسے آثار نہ تھے مگر وہ قطعی طور پر گمبارے ہوئے اور پریشان نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ ایک باہت اور حوصلہ مند انسان تھے انہیں بڑھ عمر کا کمرے دل کو ایک تقویت سی پہنچ رہی تھی کہ اس مشکل میں میرا کوئی ساتھی تو ہے۔

اس عمارت کے برآمدے میں، میں ایک لمبے کے لئے ٹھنک گیا ایک کونے میں دو جوان مرد زخموں سے چوڑے کرہا رہے تھے اور ان کے چہروں پر خراشیں اور زخم کے نشان تھے ان کے لباس بھی تار تار تھے اور زخموں پر خون جما ہوا تھا۔ وہ گتے فرش پر پڑے کاپ بھی رہے تھے ان کے پاس کرسی پر ایک بد معاش ہنزا اور ہندو قے لئے بیٹھا سہرا دے رہا تھا۔

میں اس کمرے میں اس بد معاش کے پیچھے پیچھے داخل ہو گیا جو میرے آگے چل رہا تھا۔ یہ ایک ہال نمائگرہ تھا یہ میں بائیں فٹ لمبا اور پندرہ فٹ چوڑا ہو گا اس کی چھت بہت اونچی تھی ایک دیوار کے پاس لمبی سی میز تھی۔ جس پر دو شیٹینوں 'فائلیں' لٹائے ہوئے اور ایک موٹی سی کتاب رکھی تھی جو انگریزی زبان کی تھی۔ اس میز کے پاس جو دیوار لوگ چیزیں رکھتے تھے اس پر جعفر کسی فرعون کے انداز میں برائے نام تھا اس کی میز کے سامنے دو کرسیاں تھیں۔ ان پر کوئی نہیں بیٹھا تھا۔ جعفر کے پاس دائیں بازو پر ایک شخص کھڑا تھا جس کے چہرے سے خباثت اور آنکھوں سے عیاری نپک رہی تھی اس کے بائیں ہاتھ پر سر ہار اور

میں کمرے سے باہر آیا تو میں نے ڈاکٹر قدرت خدا کو دیکھا وہ سامنے والے کمرے سے نکل رہے تھے اور ایک مسکینہ معاش روواڑے پر ان کی طرف بندھ کر آئے کھڑا تھا میں نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر قدرت خدا کو سلام کیا اور ان سے مصافحہ کیا۔ ”کئے خیریت تو ہے؟“

”خیریت نہیں معلوم ہوتی۔“ وہ انگریزی میں بولے۔ ”معلوم نہیں اس شیطان مردود نے اس وقت ہمیں کس لئے اپنے دفتر طلب کیا ہے؟“

”ہائیں مت کرو خاموشی سے چلے رہو.....“ ایک بدعاش نے پیچھے سے میری پشت پر ہندو کی نال رکھ کر اتنے زور سے دھکا دیا کہ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ زمین پر پڑنے کے نل کر پڑا۔ ڈاکٹر قدت خدا نے سرعت سے آگے بڑھ کر میرے پاس پہنچ کر میرا بازو پکڑ لیا۔ مجھے اٹھا کر کھڑا کیا تو اسی بدعاش نے آگے بڑھ کر میری کمر پر ایک لات رسید کی۔ ”سالا! خود سے کھڑا نہیں ہو سکتا.....“

میں بحرِ زمین بوس ہو گیا تھا۔ ڈاکٹرِ قدرتِ خدا نے مجھے دوبارہ سارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش نہیں کی اس لئے کہ اس بد معاش نے ان کے شانے پر بندوق کا بٹ دے مارا تھا۔ گوان کی عمر ساڑھے برس کے لگ بھگ تھی لیکن وہ صحت مند، مضبوط جسم کے آدمی تھے چاق و چوبند بھی تھے یہ وہ کاری ضرب بہہ گئے، زمین بوس ہو تے ہوئے بچے تھے اس لئے کہ انہوں نے اپنا توازن برقرار رکھا تھا۔

میرے اندر نفرت وغصے کا ایک ریلا آیا جسے میں نے بڑی مشکل سے روکا۔ یہ موقع نہیں تھا کہ میں اس ذلیل شخص سے دو دو ہاتھ کروں۔ یکبارگی میرے پی میں آیا تو تھا کہ جیب سے ریو اور نکال کر اس کا پورا چیچر اس پر خالی کر دوں اور اس جنگ آئینہ سلوک کا اس کیلئے بدل لے لوں۔ ہم دونوں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جس پر اسے اتنا غصہ آیا تھا اور پھر اس نے ڈاکٹر قدرت خدا کے ساتھ جو سفاکانہ سلوک کیا تھا اس پر میرا خون اور کھول اٹھا تھا۔ مرادو خاموشی اس لئے بھی ضروری تھی کہ وہ تھوہا میں تین تھے ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی اور دو کے ہاتھ میں شین گئیں۔ میرے جواب میں ملے پر وہ ہم دونوں کو بھون کر رکھ دیتے۔ میں تیزی سے کپڑے جھانٹتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور خاموشی سے ملے لگا۔

عمارت سے باہر آ کر میں نے کھلی فضا میں سانس لیا ایک عجیب سی راحت محسوس ہوئی دو چار دن کے بعد مجھے کھلی فضا میں آنے کا موقع ملا تھا۔ آزادی کی نعمت بھی کیسی

”قصور.....؟“ جعفر اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ہم دونوں کے پاس آ کھڑا ہوا۔ ”قصور یہ ہے کہ آپ دونوں آپریشن والے دن میاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔“

”یہ بھوت ہے۔“ میں نے تیز آواز میں کہا۔ ”یہ بات آپ سے کس نے کہی؟“

”کس نے کہی.....؟“ جعفر سرتی کی طرف دیکھ کر زہر خندا انداز سے مسکراتے لگا۔ ”کس سرتانے..... سنا ہے کہ آپ نے اس مقدمہ کے لئے اس پر محبت کا جال پھینکا۔ اسے شادی کالاج دیا سبز باغ دکھائے آپ یہ بھول گئے کہ یہ آپ کی نہیں میری محبوبہ ہے۔“

میں اب سمجھ گیا کہ سرتانے ہم دونوں کو میاں بلائے کے لئے کیا جال چلا۔ اس کی چال کا سیاق دہی تھی کمرے میں اتفاق سے جعفر اور بندو تھا اور چارہد معاش اور بھی تھے تین حسین اور معصوم لڑکیاں بھی تھیں جن کے ساتھ داویش منانے کے خواب یہ دونوں شیطان دیکھ رہے تھے۔ دو بد نصیب بھی برآمدے میں زخموں سے چور کر رہے تھے اب مجھے اپنی تدبیر پر عمل کرنا تھا یہ کام آسان آسان بھی نہیں لگ رہا تھا۔

میں نے سرتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سرتانے! مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی تم مکار فریبی اور دغا باز نکلیں میں نے فرار کا منصوبہ نہیں بنایا تھا میں نے تو تم سے اتنا کہا تھا کہ کسی طرح مجھے اس آپریشن سے نجات دلا دو تو میں تم سے شادی کروں گا۔“

”اب تم سزا کے خوف سے کمر رہو۔“ سرتانے غصہ ہو کر کہا۔ ”تم نے مجھے کس قدر پریشان کیا میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔“

”مسٹر سالار!“ جعفر واپس جا کر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”کیا آپ کے خیال میں میاں سے فرار ہونا ناست آسان ہے؟ نہیں مسٹر سالار!..... نہیں۔ آپ ایک کیا دس سرتاؤں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیں تو فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ میاں پر اور اس تنظیم میں جتنے بھی لوگ ملازم ہیں وہ اس دیش کے ایک سے ایک خطرناک اور مغرور مجرم ہیں! پیشہ ور قاتل ہیں ان کے نزدیک کسی کو قتل کرونا ایسا ہی ہے جیسے راستے کے پتھر کو ٹھوکر مار دینا۔ یہ لوگ رات دن سخت پہرہ دیتے ہیں میاں سے کسی کا فرار ہونا ناممکن ہے۔“

”خیر ایسا بھی نہیں ہے۔“ میں نے اسے چیلنج کے انداز میں کہا۔ ”مجھے تین چار دن کی مصلحت دی جائے تو میں میاں سے فرار ہو کر دکھا سکتا ہوں۔“

پارو کھڑی مسکرا رہی تھیں ”میں نے پارو کو دیکھا وہ نہ صرف بہت حسین تھی بلکہ پرکشش بھی تھی۔ میں نے تین جوان لڑکوں کو دیکھا جو ایک بچہ پر طوفان کے خوف سے سہمی چڑیا کی طرح بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے سفید پڑتے چلے گئے تھے اور ان میں جیسے لوہو کی ایک بوند بھی نہ ہو وہ غمروں سے بھی بد زد دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی پھٹی پھٹی دیران آنکھوں میں سے دہشت جھاٹک رہی تھی اور آنسوؤں سے بھری تھیں ان کی حالت اس طرح سے غم پر ہی تھی جیسے انہیں سولی پر چڑھائے جانے کا اندیشہ ہو۔ ان کا لباس اور بال بھی بکھرے ہوئے تھے وہ اپنی وضع قطع اور چہرے غمروں سے اچھے گھرانوں کی لگ رہی تھیں ”بندو ان تینوں کو لپٹائی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور جعفر سے کہہ رہا تھا۔ ”سرا! آپ ان تینوں کو کل جزیرے پر نہ بھیجیں۔“

”وہ کس نے کہے.....؟“ جعفر نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں سرا!“ اس کا جملہ بڑا معنی خیز تھا۔

”میں خود بھی نہیں چاہتا کہ ایسے انمول بہروں کو کل ہی جزیرے پر بھیج دوں۔“ جعفر ان تینوں کی طرف گہری نظروں اور شیطانی مسکراہٹ سے دیکھنے لگا۔ ”لیکن انہیں میاں ایک رات رکھنے سے کیا ہو گا میں باس کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا کل ان کا ٹیلیفون آ گیا تو.....؟“

”آپ ان کی بیماری کا بھانہ کر دیں اور ان سے کہہ دیں کہ تینوں کو تیز بخار چڑھا ہوا ہے۔“ بندو نے جعفر کو مشورہ دیا۔

”ہاں..... یہ بھانہ چلے گا۔“ جعفر کا چہرہ انجانے خیال سے کھل اٹھا۔ ”تو پھر آج کی رات جشن کا اہتمام کرو۔“ انہیں سرتا اور پارو کے حوالے کر دو تاکہ وہ انہیں دلبلوں کی طرح سنوار سکیں۔“

سرتا ہماری طرف دیکھ کر استہزائی انداز سے مسکراتی گئی اور جعفر کی طرف دیکھتی ہوئی جلدی سے بولی۔ ”سرا! یہ لیجئے۔ آپ کے باغی آگے پہلے ان دونوں سے نہیں پھر جشن منائیں۔“

جعفر اور بندو نے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ جعفر نے ہم دونوں کو زہریلے لہجے میں مخاطب کیا۔ ”اچھا تو آپ دونوں تشریف لے آئے۔“

”آپ کے آدمیوں نے ہم دونوں کے ساتھ بڑی ذلت کی ہے۔“ ڈاکٹر قدرت خدانے شکایت کی۔ ”آخر ہمارا قصور کیا ہے؟“



چنگ نکل وہ قلابازیاں کھاتا ہوا اور اسے جاگرایا۔ میری ملک برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ اس سے نہ صرف اس کی ہڈی ہیلیاں مل گئی تھیں بلکہ اس کے سارے کس مل نکل گئے تھے۔ اس نے اپنے لٹنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا۔ یہ سو رہتا ہوا سخت جان چونک کر اس کا سر بھی دیوار سے ٹکرایا تھا اس لئے وہ اپنا سر پکڑ کے پیٹھ کیادہ کر رہا ہے اور مجھے غلط گالیاں بکتے لگا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہو تا تو وہ بے ہوش ہو جاتا یا مرجاتا.....

کمرے میں موجود سارے کے سارے اس لڑائی کے منظر کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور جعفر کے سر پر چاٹنچا اور اپنی جیب سے ریو الوور نکال کر اس کی کینچی پر رکھ دیا۔ ”اگر تم نے اپنی جگہ سے لپکے کی کوشش کی تو تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کردوں گا.....“

یہ دوسرا منظر پہلے والے منظر سے کہیں زیادہ خیر انگیز اور سنسنی خیز تھا۔ یہ اچانک اور غیر متوقع طور پر پیش آیا تھا اس لئے بد معاش ششدر ہو کر رہ گئے تھے۔ کمرے میں موجود بد معاشوں نے میری طرف شبن گئیں بندوقیں مان لیں۔ میں جعفر کے اثرات دیکھ نہ سکا اس لئے کہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ میں نے ریو الوور کی نال سے اس کی کھوپڑی کو ٹوکا دیتے ہوئے کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوہ اپنی بندوقیں پھینک دیں۔“

”اس طرح تم اپنا نقصان کر رہے ہو سالار“ جعفر کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ ”میرے آدمی تم سب کو بھون کر رکھ دیں گے۔“

”یہ تو بعد کی بات ہے۔“ میں نے تیز دہنہ سب میں کہا۔ ”اگر تم نے میری بات نہ مانی تو فی الحال مجھے تمہیں سب کباب کی طرح بھونا پڑے گا۔ میں پہلی گولی تمہاری ران میں ماروں گا۔ دوسری گولی تمہارے بازو کو پھاڑتی ہوئی نکل جائے گی تیسری گولی تمہاری دائیں آنکھ میں.....“

”ایک منٹ..... ایک منٹ.....“ وہ خوفزدہ لہجے میں چلایا۔ پھر اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”اپنی بندوقیں پھینک دو.....“

ان بد معاشوں نے اس کے حکم کی فوری طور پر تعمیل کی انہوں نے ایک ایک کر کے اپنی بندوقیں فرش پر پھینک دیں۔ میں نے تب انہیں حکم دیا کہ ایک کونے میں جا کر منہ کے بل لیٹ جائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں انہوں نے ذرا بھی تساہل نہیں کیا۔ ان کے منہ کے بل فرش پر لیٹتے ہی کمرے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سرتا ہوا ریو الوور کمرے سے نکل کر میرے پاس آئیں ان کے چہرے دمک رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو

جعفر نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر بھنے لگا۔ ”یہ جنگل نہیں ہے مسٹر سالار! یہ گاؤں ہے قید خانہ ہے ایک جہنم ہے۔“

”یہ واقعی جہنم ہے.....“ میں نے بندوقی طرف دیکھا۔ ”اس لئے اس جہنم میں ایسے رذیل اور خبیث بھی ہیں۔“ میں نے دانت طور پر یہ حملہ کیا تھا تاکہ بندو جعفر کے پاس سے کسی طرح تو ہٹے۔ جب اس نے اپنی شان میں میرے بازو کا غلطانے تو اس کا چہرہ سخت کیادہ ٹھنڈے اور نفرت سے مجھے گھورتا ہوا میری طرف براہیجے کپاہی چبا جائے گا۔ جعفر ایک دم سے چیخا۔ ”بندو! رک جاؤ۔“

بندو جو میرے قریب پہنچ چکا تھا اس نے رک کر جعفر کی طرف دیکھا۔ ”اس کیلئے یہ مجال کہ مجھے رذیل اور خبیث کہے۔“

”دو تین ہٹ مبرو تو کرو.....“ جعفر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ ”پھر اس کے بعد ان کی جی بھر کے درگت بنالیتا۔“

”اگر اس کتے کے دل میں کوئی ارمان ہیں تو نکال لینے دیجئے۔“ میں نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ”اس نے مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے۔ اگر میں نے اسے چھٹی کا دودھ یا د نہیں دلایا تو میرا نام بھی سالار نہیں.....“ میں اسے اشتعال دلانا چاہ رہا تھا۔

”آپ اسے نہیں جانتے ہیں مسٹر سالار“ جعفر کہنے لگا۔ ”یہ وہ شخص ہے جس نے مجھ دہلیش کے قیام کے بعد سات سو ہزار یوں کو ذبح کر کے پھینک دیا۔ اس پر آبروریزی اور ڈاکہ زنی کے الزامات ہی نہیں ہیں یہ سرکاری افسران کے وشیانہ قتل میں بھی ملوث ہے۔ یہ انسانوں کو مرغیوں کی طرح ذبح کر دیتا ہے۔ بتر ہے آپ اس سے نہ انجھیں..... میں نہیں چاہتا کہ آنکھوں کی تبدیلی کا آپریشن مؤخر ہو جائے اور یہ پاس کے قصاب کاشانہ بن جائے۔“

”مجھے ذرا اپنے دو ایک ہاتھ تو دکھانے دیں تاکہ اس کی عقل ٹھکانے آجائے۔“ بندو جعفر سے کہہ کر میری طرف گھوا۔

میں نے جو ڈور کرائے کی تربیت حاصل کی ہوئی تھی۔ اس خبیث کی تعریف سن کر میرا کچھو لڑ گیا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ایک شخص ایسا بھی شقی القاب ہو سکتا ہے۔ میرے دل میں اس کے خلاف نفرت اور غصے کا ایک طوفان اٹھا۔ وہ میری طرف بڑھتا تھا کہ میں جیتے کی مانند اچھلا اور ایک زبردست فٹنگ ٹکک اس شیطان کی توند میں ماری۔ میرا جوتا بڑا مضبوط اور نوکیلا تھا اس لئے اس کی ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کے منہ سے ایک ہولناک



زبان غیر محسوس انداز سے اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر قدرت خدا سے کہا۔  
”ذرا آپ بھی اس سو پر نظر رکھیں یہ دونوں پر قول رہے ہیں۔“

سریتا اندر داخل ہوئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا لٹافہ اور ایک فرسٹ ایڈ بکس تھا جس میں انجکشن اور سرینج تھے۔ ڈاکٹر قدرت خدا اور سریتا نے مل کر فرش پر سنا کے مل لینے ہوئے بد معاشوں کے بازوؤں میں انجکشن لگانا شروع کر دیئے جب وہ دونوں ان سب کے انجکشن لگاتے لگاتے تو سریتا ایک سرینج لے کر میرے پاس آئی تاکہ جعفر کے انجکشن لگا دے۔ ”اے انجکشن نہیں لگانا.....“

”وہ کیوں.....؟“ سریتا نے حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر مجھ سے بولی۔ ”آپ اس موڈی سانپ کو ایسے ہی چھوڑ دیں گے۔“

”ہم اس سانپ کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے اور اس سو کو بھی..... تاکہ راستے میں ان کے آدمی ملیں تو ہم انہیں ڈھال بنا سکیں۔“ پھر میں نے سریتا کو مختصر طور پر بتایا کہ ان دونوں کے ساتھ رہنے سے ہمیں کیا فائدہ ہو گا۔ میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

”پارو اب تک ان بد معاشوں کو لے کر یہاں کیوں نہیں پہنچی.....؟“ سریتا تشویش سے بولی۔ ”میں دیکھ آؤں.....“

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا پھر ہم سب نے ایک حیران کن اور خوش کن منظر دیکھا چاروں بد معاش ایک قطار میں جنگی قیدیوں کی طرح اپنے ہاتھ اٹھائے اندر داخل ہو رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے پارو بھی۔ پارو کے ہاتھ میں شبنم گن تھی۔ پارو نے اندر داخل ہو کر ان بد معاشوں کو فرش پر اندھ سے منہ لٹھ جانے کا حکم دیا تو انہوں نے ذرا سی چوچرا بھی نہیں کی۔ سعادت مند شاگردوں کی طرح انہوں نے حکم کی قیامت کی تھی۔

سریتا نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ اس نے ان چاروں بد معاشوں کے بازوؤں میں بھی سوئی کھونٹ دی جن بد معاشوں کو پیلے سوئی لٹائی گئی تھی ان پر غنودگی چھانے لگی تھی۔ پارو نے مجھ سے پوچھا۔ ”اب کیا کرنا چاہئے.....؟ سارے بد معاش یہاں آچکے ہیں۔“

”اب ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہئے۔“ میں نے کہا۔ ”مندی کنارے تیز اور

جدید ترین لالچ کھڑی سے ہم کسی بھی قریبی شہر میں جلد پہنچ سکتے ہیں۔“

”ایک کام اور باقی رہ گیا ہے مسٹر سالارا!“ سریتا بولی۔ ”جعفر کی خوب گاہ کی الماری

”اگر تم نے ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نکالا تو میں پھر ایسی ہی ایک کلک اور تھماری پٹلی پر لگاؤں گا..... چلا کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں تم کس لئے جج رہے ہو۔ اس طرح تم اپنے ان ساتھیوں کو خبردار کرنا چاہتے ہو جنہیں پارو بلانے لگی ہے۔“

میری دھمکی کا رگر ثابت ہوئی۔ بندو ایک دم خاموش ہو گیا۔ پھر جعفر نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مسٹر سالارا تم یہ مت بھولو کہ تم اور تمہارے یہ ساتھی میرے پاس کے انتقام سے نہیں بچ سکتے وہ کس قدر خطرناک اور ہوشیار ہے تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کون سی جگہ ایسی ہے جہاں اس کے آدمی نہ ہوں۔ اس کی لٹاچیں اور گاڑیاں انسانوں کا شکار کر رہے تھے لے کے محکم پھر نہ رہی ہوں۔ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس کی بڑی بیانیگ سزا ملے گی۔“

”جعفر! کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔ اب تمہارے پاس کے بدن جی گئے جا چکے ہیں۔ اب اسے بھی اپنے ظلم و ستم کا ایک ایک حساب دینا ہو گا۔ قدرت نے شاید اس کا خاتمہ کرنے کے لئے مجھے اتنی دور سے یہاں بھیجا ہے میں اس قدر عمدہ صفت آدمی کو قانون کے حوالے کر کے رہوں گا جو انسانوں کا شکار کرتا ہے..... تم بھی اس کے ساتھ نیست و نابود ہو جاؤ گے۔“

جعفر میری بات سن کر ہنسنے لگا اس کی ہنسی اتنی زہریلی تھی جیسے وہ تنگے بدن کو کسی خنجر کی نوک کی طرح کاٹتی جا رہی ہو۔ میرے جی میں تو آیا کہ اس کی کھوپڑی میں ایک نہیں پورے چھ سو رانج کر دوں پھر اس نے اپنی ہنسی کو روکنے ہوئے کہا۔ ”مسٹر سالارا یہ تمہاری عارضی فتح ہے۔ اس کا خب جی بھر کے جشن منالو۔ جیسے ہی تم لوگ یہاں سے نکلو گے میرے پاس کے آدمی تم سب کو گرفتار کر لیں گے..... پھر تم سب کا جو مشر ہو گا اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تمہارے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال دیئے جائیں گے۔ دینا والوں کو تم سب کا نام و نشان تک نہیں ملے گا۔“

اس کی باتیں سن کر لڑکوں میں خوف و ہراس پھیل گیا اور ان کے چہرے پھر سفید پڑتے چلے گئے۔ یہ بھی اس کی ایک چال تھی وہ ہمیں خوفزدہ کر رہا تھا تو دوسری طرف اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی باتوں میں آ جاؤں گا میں محتاط اور چوکنا کھڑا سریتا کی راہ دیکھ رہا تھا پارو کا بھی انتظار تھا میں جانتا تھا کہ جعفر مجھے باتوں میں لگا کر غافل کرنا چاہتا ہے۔ وہ شاید بندو کو اشارے بھی کر رہا تھا بندو کی نگاہوں کی

میں کہا۔

”شکاری کا کام شکار کرنا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جس طرح تمہارا پاس انسانوں کا شکار کرتا ہے اسی طرح میں بھی تمہیں شکار کر رہا ہوں اور تمہاری ہر چیز پر قبضہ کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ یہ چیزیں تمہاری نہیں ہیں یہ گھڑی میرے دوست مشتاق چوہدری کی ہے گویا تم اس کے قاتل ہو۔“

”مشتاق چوہدری.....؟ ہاں اس کا قاتل ہوں۔“ جعفر نے اعتراف کیا۔ ”یہ وہ پہلا شخص تھا جو جزیرے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا مگر میں نے اسے شدید زخمی کر دیا تھا اسے فوراً مرنے کا سامنا کرنا پڑا۔“ میں نے اپنے شہر جا کر ایک دن موت و زندگی کی کشمکش میں رہ کر مر گیا ہوا بتا دیا تھا۔“

”مشتاق چوہدری میرا دوست تھا میں نے اس کی موت پر قسم کھائی تھی کہ میں اس کی موت کا بدلہ لے کر رہوں گا اور.....“ دفتا ایک دل خراش چیخ فضا میں بلند ہوئی جو پارو کی تھی۔ ”سالار..... چپتا..... پر شور.....“

میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اڑیوں پر گھوم گیا میں نے اپنے دشمن کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ بندو کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا اور وہ کسی شکاری کتے کی طرح غرائز اپنا ہاتھ فضا میں بلند کر چکا تھا اور مجھ سے ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو اس کا خنجر میرے بدن میں اتر چکا ہوتا۔ میں نے ہچکچاہٹ دی تو خنجر میرے سر کے بالوں میں سے گزرتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ جب اس نے اپنا نشانہ خطا دیکھا تو کسی درندے کی مانند اس نے مجھ پر جست لگائی اس کا یہ وار بھی خالی گیا۔

میں نے اس سے پہلے کہ وہ شیلے اس کی پیلی میں بوٹ کی نوک اس زور سے دے ماری کہ وہ ہلکا کر توئے نگاہ اس کی حالت دم توڑتے ہوئے زخمی پر بندے کی سی تھی۔ پارو بڑیانی انداز میں چیخا۔ ”سالار! یہ سانپ ہے سانپ..... آپ اسے گولی ماریں یہ مجھے دوپٹے سے بری طرح ڈسٹا رہا ہے سالار.....“ یہ آپ کو بھی موقع ملنے پر جان سے مار دے گا.....“

”نہیں.....“ میں نے پارو سے کہا۔ ”اے سزا قانون دے گا۔ میں قانون کو ہاتھ میں لینا نہیں چاہتا۔“

”سزا..... نہیں سالار نہیں.....“ یہاں سزا مجرموں اور ظالموں کو نہیں ملتی سزا کے لئے غریب اور مظلوم پیدا ہوئے ہیں اسے جیل ہو جائے گی اس پر دو تین برس

میں ہزاروں تو لے سوتا“ ہزاروں لاکھوں ناکا اور چھوٹا موٹا اسلحہ پڑا ہے جو مسافروں سے لوٹا ہوا مال ہے کیا خیال ہے اسے بھی لے لیا جائے.....“

”کیوں نہیں.....“ میں نے سر ہلایا۔ ”کاش! میرے پاس بم ہو تے تو میں ان عمارتوں کو دھماکوں سے اڑا دیتا۔“

”شور روم میں بندروں کا اس قدر ذخیرہ موجود ہے کہ ان تمام عمارتوں کو آگ لگائی جاسکتی ہے۔“ پارو بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ اس گاؤں کو چاروں طرف سے آگ لگا دینا چاہئے تاکہ اس شخص گاؤں کا نام و نشان نہ رہے.....“

”نہیں..... نہیں۔“ ڈاکٹر قدرت خدا جلدی سے بولے۔ ”ایسی حادثات کی ضرورت نہیں یہ گاؤں اور عمارتیں کل لوگوں کے کام آئیں گی جب ہم پولیس میں اس کے خلاف رپورٹ درج کرائیں گے پولیس اس علاقے پر کنٹرول حاصل کر لے گی یہاں ہو سکتا ہے ہسپتال اور سکول بھی کھول دے جس سے آس پاس کے گاؤں والوں کو فائدہ پہنچے.....“

”ڈاکٹر ٹھیک کہتے ہیں پارو!“ میں نے تائید ی لبے میں کہا۔ ”دو ایک ہفتے میں یہ گاؤں نہ صرف پوری طرح جلا جائے گا بلکہ طوفان اور سیلاب کے دنوں میں آس پاس کے چھوٹے گاؤں والے یہاں آکر محفوظ رہ سکیں گے۔“

سربراہان تینوں لڑکیوں کو ساتھ لے کر بلائی منزل پر چلی گئی اور ہارون نے کہیں سے رسی تلاش کر کے دی تو میں نے جعفر کے دونوں ہاتھوں کو پیچھے لے جا کر انہیں مضبوطی سے باندھ دیا اور پھر ہارون نے دوسری رسی سے پھندا بٹا کر اس کے گلے میں ڈال دیا تاکہ اسے کسی جانور کی طرح ہانک کر لے جایا جاسکے۔ ڈاکٹر قدرت خدا فرسٹ ایڈ بکس لے کر برآمدے میں چلے گئے تاکہ ان دونوں نوجوان مردوں کی مرہم پٹی کر سکیں۔ اور صحنہ نے جعفر کو کرسی سے اٹھا کر دیوار کی طرف کھڑا کر دیا اور اس کی جامہ تلاشی تو اس کی جیب سے ایک بھاری بٹا اور پتول ملا میں نے بٹا اکھول کر دیکھا تو اس میں چار پانچ ہزار کی رقم چھوٹے بڑے نوٹوں کی شکل میں تھی اس کے علاوہ ایک چھوٹی اور پتی نوٹ بک بھی تھی جس میں بہت سارے نام پچے اور ٹیلیفون نمبر درج تھے۔ پھر میں نے اس کی کلائی سے دستی گھڑی بھی اتار لی جو بیرونی کی تھی یہ گھڑی میں بائیس ہزار ناکا سے کم نہیں تھی۔ یہ گھڑی کس کی تھی مجھے معلوم تھا۔

”مسٹر سالار! یہ آپ شکاری سے رہزن کیسے ہیں گئے؟“ جعفر نے تھک کر آمیز انداز



مقدمہ چلتا رہے گا پھر یہ رہا ہو جائے گا..... سزا تو مجھے ساری زندگی کے لئے ملی ہے....." پارو بڑی جذباتی ہو رہی تھی اس کا لہجہ وحشی ہو رہا تھا اس کی آنکھیں لال لال ہو رہی تھیں وہ کسی وحشی قاتل کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

"اس کی سزا موت ہوگی اس لئے کہ اس نے انسانوں کو زنجیر کیا ہے افسران کو قتل کیا ہے۔ قانون اسے تختہ دار پر لٹکا دے گا....."

پارو پر یک لخت انتقام کا جنون سوار ہو گیا تھا میں اسے روکنا ہی رہ گیا اس نے شین گن شانے پر رکھ کر بند پر برست دے مارا۔ بندو بے آہانی کی طرح ڈپ کر ٹھنڈا ہوا گیا اور پارو شین گن کا جھکرا داشت نہ کر سکی وہ فرش پر شین گن سمیت گر پڑی میں نے لپک کر اسے اٹھایا دوسرے ہاتھ میں شین گن لے لی۔ "تم نے کیا کیا پارو.....؟ اس درندے کو تم نے اس آسانی سے مرے دیا۔"

"میں نے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا ہے....." اس کی سانسیں بری طرح پھول رہی تھیں اور اس کا چہرہ جھٹکا رہا تھا۔ وہ اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"میرے اندر انتقام کی جو آگ بجھ کر رہی تھی آج وہ بجھ جائے گی کاش! یہ کیسے بھرزندہ ہو جائے میں اسے پھر بھون ڈالوں....."

تب وہ کسی نوٹے ہوئے دروازے کی طرح میرے سینے سے اٹھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اس کے بازو کو سہلاتا ہوتے تسلی دینے لگا اور اسے سریتا اور وہ تینوں لڑکیاں بھی آگئیں۔ ڈاکٹر قدرت خدا بھی آگئے ان سب نے بندو کی لاش خون میں لت پت دیکھی تو وہ اپنی جگہ ٹھنک گئے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ بندو کو میں نے قتل کیا ہے۔

"مغز سالارا" ڈاکٹر قدرت خدا بولے۔ "آپ نے بڑی جلدی کی اسے قتل نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

"میں نے نہیں پارو نے اسے قتل کیا ہے اس سے اپنے ظلم و ستم کا بدلہ لیا ہے۔"

میں نے انہیں بتایا۔

"پارو نے اچھا کیا....." سریتا بندو کی لاش کے قریب جا کر اس کے منہ پر تھوکتی ہوئی بولی۔ "اس نے عورت کو ایک کھلوٹا سمجھ رکھا تھا اس کیبنے نے حد کر دی تھی۔" پھر اس نے بندو کے چہرے پر ایک لات رسید کی۔ "ذلیل..... آخر تم کتے کی موت مرے نا....." وہ کسی انگن کی طرح چھکارا۔

"سرتا!" میں نے کہا۔ "یہ وقت باتوں میں ضائع کرنے کا نہیں ہے۔ دن ڈوبنے سے پہلے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا ہے۔ تم نے اپنا کام ختم کر لیا؟"

"نہیں..... کچھ کام باقی ہے۔" سریتا نے جواب دیا اور وہ ان تینوں لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے کر اوپر چلی گئی۔

میں نے بندو کی طرف دیکھا اس کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلی ہو گیا تھا اور ابھی تک زخموں سے خون اہل رہا تھا۔ اس کی کھلی آنکھیں جو چھت کو تک رہی تھیں ابھی بھانک رہی تھیں کہ انہیں دیکھ کر بدن پر بھر پوری سی آگئی تھی۔

پارو کے آنسوؤں نے میرا گردن بھگو دیا تھا۔ میں نے اسے اپنے سینے سے الگ کر کے جیب سے رومال نکالا۔ اس کے آنسوؤں کو پونچھتا ہوا بولا۔ "پارو! اب چلنے کی تیاری کر۔ ہمیں کھانے پینے کا سامان ساتھ لے لینا چاہئے۔ کیوں؟"

تھوڑی دیر کے بعد ہم وہاں سے نکل رہے تھے تو سرتا اور ان لڑکیوں نے کچھ چیزیں اٹھا رکھی تھیں جن میں سونے کے زیورات اور رقم تھی۔ زخمی مرد اس قاتل تھے کہ چل سکیں۔ سریتا بے وحشی کے انجشن کے ساتھ ساتھ طاقت کے بھی انجشن اور دو انیاں ڈپنری سے لے آئی تھی۔ ڈاکٹر قدرت خدا نے ان دونوں جوانوں کو انجشن لگا دیے تھے۔ پارو نے وہ سی پکڑی ہوئی تھی جس کا پینڈا جعفر کے گلے میں پڑا تھا۔ اسے قربانی کے جانوروں کی طرح کھینچنے لے جا رہی تھی۔ میرے ایک ہاتھ میں ریو اور دوسرے ہاتھ میں ایک شین گن تھی۔ ان دونوں مردوں کے ہاتھ میں بھی اسلحہ دے رکھا تھا۔ ڈاکٹر قدرت خدا کے ایک ہاتھ میں دو اوڈن کا تھیلا اور فرسٹ ایڈ کس تھا۔ دوسرے ہاتھ میں جو تھیلا تھا اس میں کھانے کا سامان.....

سرتا نے لاچ کے پاس رک رکھ کر پوچھا۔ "یہ لاچ کون چلائے گا؟ لاچ کے آدمیوں کو تو ہم نے انجشن لگا دیے ہیں۔"

"میں چلاؤں گا....." میرے بجائے ڈاکٹر قدرت خدا نے جواب دیا۔

"سرتا! آپ کو لاچ چلانا آتی ہے....." سریتا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"کیوں نہیں....." وہ بولے۔ "میری دو تین مسافر لائیں ہیں۔ اس کے علاوہ میری اپنی ایک ذاتی لاچ بھی ہے جو بالکل ایسی ہی ہے۔ میں آکٹر بنا گاگے سے سندپ یا باریلال فیملی کے ساتھ جاتا ہوں تو اسے میں اور میرے بچے چلاتے ہوئے جاتے ہیں۔"



مجھے اچانک انجانے خوف کا سا احساس ہوا تو میں نے پارو سے کہا کہ اس کا یہاں اس طرح سے کھڑے رہنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس گرود کے بد معاش اپنے سینہوں اور لائچوں میں ستر کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے تمہیں دیکھ لیا تو انہیں شک ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ تعداد میں نہ صرف زیادہ ہوں گے بلکہ مسلح بھی ہوں گے اور ان سے لڑنا اور مقابلہ کرنا آسان نہیں ہو گا۔ بہتر ہے کہ وہ پیچھے چلی جائے۔ میں اوپر رہوں گا اور ہر دو پتار ہوں گا۔ ندی میں گرنے والی لائچوں اور سینہوں پر کڑی نظر رکھوں گا۔

پارو پیچھے چلی گئی تو میں کاپٹ پٹ میں چلا آیا۔ کاپٹ پٹ میں ڈاکٹر قدرت خدا اوہیل کو کنٹرول کے کھڑے تھے اور جعفر فریڈ پر پارو کے سامنے بٹھا دو گھ رہا تھا۔ اب تک کسی سینہ اور لائچ سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ ہم سب ایک طرح سے تیار اور اسلحہ سے لیس تھے۔ میرے ہاتھ میں ایک شین گن تھی۔ جیب میں ریو اور پارو کا تو بھی تھا۔ پارو اور سریتا بھی بتول اور ریو اور ساتھ لائی تھیں۔ اس کے علاوہ دو ایک بند و قبیل اور شین گنیں بھی اس لائچ کے سنور سے ہاتھ لگ گئی تھیں۔ اس اسلحہ کا استعمال ہر کسی کو نہیں آ سکتا تھا ہم اس کی موجودگی سے ایک طرح تسلی سی تھی۔

ڈاکٹر قدرت خدا نے لائچ کو چلانے کے بارے میں مجھے اچھی طرح سمجھا دیا۔ میں نے ایک ایک بات کو بڑے غور سے سنا اور اسے ذہن نشین کر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سریتا ہم تینوں کے لئے کافی ایکٹ اور انڈوں کے سینڈیج لے آئی۔ جعفر کو مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا پڑا۔ کافی پانا پڑی اس لئے کہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ہم نے اسے پوری طرح بے دست پابرکے رکھا ہوا تھا۔ یہ کسی موڈی سانپ سے کم نہیں تھا۔

میرے اور ڈاکٹر قدرت کے بارے میں یہ طے پایا کہ راستے میں کوئی شہر یا لائچ مل گئی تو اس میں میرے اور جعفر کے سوا تمام لوگ سوار ہو جائیں گے بھلے وہ کبھی بھی جاری ہو۔ یہ دشمنوں کے ممکنہ سامنا ہونے کے خیال سے سوچا گیا تھا۔ میں اس لائچ میں اس لئے رہنا چاہتا تھا کہ کسی صورت اس جزیرے میں پہنچوں۔ اس بات کا امکان تھا کہ مجھے بد معاش پکڑ کر جزیرے پہنچا دیں گے۔ پھر میں نے اپنا خیال بدل دیا۔ جعفر سے پولیس اس جزیرے کے بارے میں انکوائری تھی۔ لہذا اسے میں نے ڈھالے جاکر پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ان سب سے مشورہ کیا تو ہمیں میری بات پر متفق ہو گئے لیکن انہیں اس بات کا بے حد دکھ اور افسوس تھا کہ وہ مجھے اس مصیبت میں تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ مجھے خدا پر اور پارو اور میردو سا ہے۔ دشمن میرا

اس کے علاوہ میں کینک بھی ہوں۔ انجن میں کسی قسم کی خرابی ہو جائے تو میں خود ہی اسے ٹھیک بھی کر لیتا ہوں۔ یہ لائچ چلانا تو بہت آسان ہے۔ اسے تو کوئی بچہ بھی چلا سکتا ہے۔

ہم سب جلدی سے اس لائچ میں سوار ہو گئے۔ عرشہ سے نیچے آگے جہاں تین چار کینک بنے ہوئے تھے اور ایک بڑا ڈانگ ہال ساتھ۔ اندر تمام تر سولتیں موجود تھیں اور اندر سے خوب آراستہ و پیراستہ تھا۔ اس لائچ کو دیکھ کر اندازہ ہوا ہاتھاکہ یہ تفریح کے لئے تھی۔ سرتا اور پارو نے بتایا کہ یہ لائچ ان کے لئے بنی نہیں ہے۔ انہیں اکثر تیس لایا جاتا تھا اور اس لائچ سے ان کی اذیت ناک یادیں وابستہ تھیں۔

ان ذہنی مردوں کو ایک کینک میں لٹا دیا گیا۔ سریتا ب کے لئے کھانے کا بندوبست کرنے لگی۔ وہ خردوار لڑکیاں صبح سے بھوکی تھیں۔ میں جعفر کو لے کر کاپٹ میں آ گیا۔ اسے ایک کونے میں بٹھا دیا۔ ڈاکٹر قدرت خدا نے اس کا انجن شارٹ کیا۔ لائچ چل پڑی میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ پارو اوپر آگئی اور عرشہ پر کھڑی ہو گئی۔ ہم اس منحوس گاؤں کو دیکھ رہے تھے جو کسی جنم سے کم نہیں تھا۔ پارو کی آنکھوں میں آنسو بہ رہے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا یہ آنسو خوشی کے ہیں یا غم کے..... لائچ نے اپنی رفتار تیز کر لی۔ گاؤں ہم سے دور ہوتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اوپے اوپے درختوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔

میں نے جعفر کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر مرونی تھی اور وحشت برس رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں سے چشمہ اتار کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ وہ گڑگڑانے لگا کہ میں اس کا چشمہ واپس کر دوں اس لئے کہ یہ چشمہ دور کی نظر کا تھا میں اس خبیث کا پورا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا چہرہ واقعی بڑا مکروہ اور ہیماںک تھا۔ میں نے تھوڑی دیر کے بعد اس کا چشمہ اسے واپس کر دیا۔

ہم تینوں ڈوبے سوج کا نظارہ دیکھنے لگے۔ پارو نے گمرے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر سالار! آپ یہاں نہیں آتے تو پھر ہمیں موت ہی اس جنم سے نجات دلائی۔“ ”یہ قدرت کے کھیل ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے بڑی خوشی ہے کہ میں کسی کے کام کو آیا۔“

”ہم آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولیں گے۔“ وہ جذباتی سی ہو گئی۔ ”کبھی آپ چاند پورا آئیں تو میرے ہاں ضرور آئیں۔“

کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد بہت دور سے ایک سنہرا آکا دکھائی دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر قدرت خدا نے لاچ کو روک لیا۔ سب لوگ عرش پر جمع ہو گئے اور اس سنہری طرف دیکھنے لگے اور دعائیں بھی مانگ رہے تھے کہ یہ سنہرہ منجھن کا نہ ہو۔ سنہر کوئی نصف فرلانگ پر ہو گا کہ اچانک خاموشی فضا میں جھفری ہو لانا چچ بلند ہوئی۔ میں اور ڈاکٹر قدرت خدا کا کاک پٹ کی طرف دھڑ دھڑے۔ سب سے پہلے میں کاک پٹ میں داخل ہوا۔ جھفری جیپیں بند ہو چکی تھیں۔ میں ٹھک کے رک گیا کیونکہ ایک دل خراش منظر نے نہ صرف میرے ہوش اڑا دیئے تھے بلکہ میرے بدن پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں کبھی ایسا دیکھنے کمرے کر دیئے والا منظر نہیں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر قدرت خدا جو میرے بعد کچھ کر میرے پاس کمرے سے انہوں نے دہشت زدہ ہو کر اپنا منہ پھیر لیا تھا۔ ان کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

جھفر خن میں لت پت فرش پر پڑا تھا۔ سر تانے رخصت ہونے سے پہلے اس سے اپنا حساب بے باقی کیا تھا اس کے سینے میں انتقام اور نفرت کی جو آگ بھڑک رہی تھی اسے جھفر کے خون سے ٹھنڈا کیا تھا۔ اس نے بڑے دھیانہ انداز سے جھفر پر چاقو سے بے درپے دار کئے تھے۔ چاقو کا چھ سات، آٹھ، نچل جھل اس کے دل کی جگہ میں اڑ چکا تھا اور زخم سے خون کا فوراہل رہا تھا۔ ہم دونوں دم بخود تھے سر تانے پر چونکہ جون سوار تھا اس لئے وہ جھفر کی لاش کو فنا خانہ نظروں سے کچھ کر استہزا کی انداز سے مسکرا رہی تھی۔

عورت جب انتقام لینے پر آتی ہے تو اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ اس نے جھفر سے بڑا بھیانک انتقام لیا تھا۔ اس سے خوفناک انتقام اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے انتقام لینے سے اس کی عزت واپس مل سکتی تھی مگر اس نے ایک درندے کو کیفر کر دیا کہ رات بچا دیا تھا۔ جھفر آج اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ اس دنیا سے ایک شیطان کا وجود بیش بہے کے لئے مٹ گیا تھا۔

میں سر تیا کو کاک پٹ سے باہر لے آیا۔ ”یہ تم نے کیا کیا.....؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے بھی وی کیا جو بارو نے کیا تھا اور ایک عورت کو کرنا چاہتا تھا۔ عورت بہت سارے ظلم و ستم برداشت کر سکتی ہے مگر بے عزت ہونا نہیں..... میں نے اور بارو نے ان دونوں درندوں سے انتقام لینے کی قسم کھائی تھی اس لئے کہ ان دونوں خبیثوں نے

ہم دونوں کو کھلوٹا بنا رکھا تھا..... یہ درندگی صرف ہمارے ساتھ ہی نہیں ہوئی تھی۔ دو تین نوجوان اور معموم لڑکیاں اور آئی تھیں جو ان درندوں کے ہاتھوں نے مظالم کا کی دو تین تک نشانہ بنی رہی تھیں اور ان کے بھائیوں کے ساتھ دہشت و بربریت کا جو سلوک کیا وہ بڑا دل خراش تھا۔ ایک روز ان دونوں بہنوں نے اس شرمناک زندگی سے نجات حاصل کرنے کے لئے فرار ہونے کی کوشش کی تو جھفر نے ان دونوں کو اذیت دے کر قتل کر دیا۔ یہی انسانیت سوز سلوک اس نے ان لڑکیوں کے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا۔ چچ پوچھے تو ہم دونوں محض اس دن کے لئے زندہ تھے۔ خدا نے آخر میری حسرت پوری کر دی۔“

سر تیا ایک ہی سانس میں بول گئی تھی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں ابھی تک ایک دھیانہ چمک تھی۔ چہرہ نفرت اور غصے سے تنہا رہا تھا جیسے اس کے انتقام کی آگ ابھی پوری طرح بجھی نہ ہو۔ میں نے اس کی جذباتی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔ میں اس وقت وہاں موجود ہو تا تو بے قفل کرنے نہیں دیتا۔ سر تیا کے اس اقدام نے دشمن تک پہنچنے کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ جھفر زندہ ہو تا تو پولیس اس جزیرے تک پہنچ کر اس گردہ کا پیشہ کے لئے خاتمہ کر دیتی۔ اب یہ نامکن ہو گیا تھا۔

اسٹیمر قریب آکر رک چکا تھا۔ میں سر تیا کو ساتھ لے کر ریگ کے پاس پہنچا۔ اسٹیمر میں مسافر بھرے ہوئے تھے۔ اتفاق سے یہ اسٹیمر دھماکے آیا تھا اور چاند پور سے ہو تا ہوا چٹا گنگ جابا تھا۔ اتنے سارے مسافروں کو دیکھ کر ایک طرح سے اطمینان ہو گیا تھا۔ اسٹیمر اور لاچ پر ایک تیس فٹ لمبا تختہ ڈال کر پل بنادیا گیا تھا کہ لاچ سے اسٹیمر میں جالیا جا سکے اور ایک طرف ایک موٹا سا مینجہ بانڈہ دیا گیا تاکہ اس کو پکڑ کے تختے پر سے گزر جا سکے۔ سب سے پہلے وہ تین لڑکیاں اور ان کے ساتھی مر گئے۔ پھر بارو..... ڈاکٹر قدرت خدا رخصت ہوتے وقت مجھ سے بڑی کر جو جی سے بھل گئے اور انہوں نے مجھ سے لئے کا وعدہ لیا۔ سب سے آخر میں جانے والی سر تیا تھی جو میرے شانے پر اپنا سر رکھ کر سسک پڑی تھی۔ وہ آنسوؤں اور سکینوں کی وجہ سے اپنے دلی جذبات اور احساسات کا ذکر نہ کر سکی مگر اس کی آنکھوں میں، میں نے پڑھ لیا تھا۔ آخر میں صرف وہ اتنا کہہ سکی۔ ”مسٹر سارا میں ساری زندگی آپ کے لئے دعا کرتی رہوں گی۔ کاش! میں آپ کے احسان کا بدلہ ادا کر سکتی۔“

درد نے اب مجھے چرچھاڑ کے ہی رکھ دیتے۔ ان کا کوئی بھروسہ نہیں تھا یہ انسان نہیں تھے اس لئے میں نے بھی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میں کسی قیمت پر ان کے ہاتھ نہیں لگوں گا۔ ان کے ہاتھ لگنے سے مر جانا بہتر ہے۔

جب ان بد معاشرین نے یہ دیکھا کہ میری لاچ تیز رفتاری سے آ رہی ہے اور ان کی لاچ سے ٹکر اجانے کا خدشہ ہے تو انہوں نے اپنی لاچ ایک طرف کر لی۔ جس وقت میری لاچ ان کی لاچ کے پاس گزرتے لگی تو میں نے ان کی لاچ میں جھانکا۔ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ یہ دشمنوں کی لاچ ہے۔ اس کے عریشے پر آٹھ دس مسلح لوگ کھڑے تھے۔ اس لاچ سے لاڈلا تیکر پر ایک آواز گونجی اور خاموش فضا میں تحلیل ہو گئی۔ ”سالارا! رک جاؤ..... اپنی لاچ لوگ لو..... نہیں تو ہم تمہاری لاچ کو کم سے کم اڑا دیں گے اور سب لوگ مر جائیں گے۔“

اس دھمکی کا میں نے کوئی اثر نہیں لیا اور میری لاچ تھی کہ اڑی جا رہی تھی۔ میں نے پھر اس فٹھن کو پیچھے چلائے ساودہ شاید اپنی بات دہرا رہا تھا۔ دشمن نے سمجھ رہے تھے کہ میری لاچ پر سب لوگ موجود ہیں۔ میں نے چند لمحوں کے بعد پیچھے پیٹ کر دیکھا تو ان کی لاچ بڑی تیزی سے میرے تعاقب میں آ رہی تھی۔ ان کے اور میرے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ یہ فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا ہے اور پھر وہ میری لاچ پر فائرنگ بھی کرنے لگے تھے۔ میں نے لاچ کی رفتار اور تیز کر دی تو ان کے اور میرے درمیان فاصلہ تو پھر بڑھ گیا لیکن لاچ کی رفتار کو قابو رکھنا میرے لئے بڑا دشوار ہو رہا تھا اس لئے کہ یہ پانی تھا۔ لاچ پانی کو کتنی بھی ہوتی جا رہی تھی۔ تیز رفتاری سے گاڑی اور لاچ چلائے میں بے ذرا فراق تھا اور پھر مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا یہ تو ڈاکٹر قدرت خدا نے مجھے سکھایا تھا اور اس وقت میرے کام آیا۔

جب میں نے پھر فاصلہ کو تیزی سے کم ہوتے اور ان کی فائرنگ کو دیکھا تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس طرح تو میں ان کے ہتھے چڑھ جاؤں گا کیا تو کوئی میرا کام تمام کر دے۔ میں اپنے بھانجے کے بارے میں سوچنے لگا تو میرے ذہن میں فوراً ہی ایک تدبیر آئی جس کی وجہ سے میں ان کے ہاتھ نہیں لگ سکتا تھا۔ اس تدبیر کے آتے ہی میں نے اس کی ساری بتیاں بجا دیں حتیٰ کہ ہینڈ لائسنس بھی۔ پھر میں نے دھیل کو لاک کر کے اسے سہولت کر دیا۔ میں کاک پٹ سے باہر نکل کر عریشے پر آیا اور اس کے اگلے سرے پر پہنچا پھر میں نے پلٹ کر دیکھا تو دشمنوں کی لاچ دائیں کنارے کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے ہم

اس کے بعد اسٹیر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ماحول کو تاریکی کی چادر نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں نے نیچے سے ایک چادر لاکر جعفر کی لاش پر ڈال دی۔ فرش پر خون سردی کی وجہ سے جلد ہی خشک ہو گیا تھا اور جم گیا تھا۔ یہ اس درد مندے کا مو تھا جو نہ جانے کتنے لوگوں کا مو بھاچا تھا اور اس کے نزدیک انسانی لمبائی سے بھی اڑاں تھا۔

میں نے لاچ کا انجن اشارت کیا اور اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ کیا اس غیثت کی لاش کو اٹھا کر پانی میں پھینک دوں؟..... یا پھر مسم کی لاش کو پولیس کے حوالے کر دوں۔ اس لاش کو پولیس کے حوالے کرنے سے میرے لئے بڑے مسئلے پیدا ہو جاتے کیونکہ یہ قتل کا کیس تھا مگر پولیس مجھے قتل کے الزام میں گرفتار نہیں کر سکتی تھی اس لئے کہ اس چاقو کے دستے پر سربراہ کی اگلیوں کے نشان تھے۔ اس وجہ سے مجھ پر فرد جرم عائد نہیں ہو سکتی تھی۔

کوئی ایک گھنٹہ کے بعد میں نے مخالف سمت سے ایک تیز رفتار لاچ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ جیسے جیسے وہ قریب آتی جا رہی تھی ویسے ویسے اس کی رفتار میں کمی آ رہی تھی۔ میری چھٹی سن اچانک بیدار ہو گئی اور مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ یہ لاچ دشمن کے آدمیوں کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ دشمن کو شاید کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ ہم لوگ وہاں سے فرار ہو چکے ہیں اور ان کی لاچ میں فرار ہو رہے ہیں یہ لاچ اسی لئے ہماری تلاش میں آ رہی تھی اور پھر اس طرح سے مدی کے پتھنوں میں چلی آ رہی تھی جیسے راستہ روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔

میں نے اپنی لاچ کی رفتار اور تیز کر دی۔ ان کے ہتھے چڑھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ایک تو جعفر کی لاش اس لاچ کے کاک پٹ میں پڑی تھی دوسرا یہ کہ اسے وحشتانہ انداز سے قتل کیا گیا تھا اور اس کے قتل کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہو جاتی۔ اس طرح بندہ کے بے رحمانہ قتل کا بھی میں ہی ان کی نظروں میں مجرم ٹھہرا تا اور وہ مجھے دہرے قتل کا ذمہ دار سمجھ کر سزا دیتے وہ یقیناً بڑی لرزہ خیز ہوتی۔ ایسی سنگدلی کا مظاہرہ کرتے کہ ہلاک کی روح بھی شرابا جاتی اور پھر میں نے ان کا گاؤں دیکھ لیا تھا جو انہوں نے دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھا تھا اور ایک طرح سے ان کے اڑے کو تخت نقصان پہنچایا تھا۔ علاوہ کس طرح مجھے بخشنے۔ وہ پہلے ہی مجھے ناکردہ گناہوں کی سزا دے رہے تھے کہ میری آنکھوں کی تبدیلی کا آپریشن کر رہے تھے اور چپے کی آنکھیں اس کی جگہ لگا رہے تھے۔ یہ

تو اس طرف نہیں آ رہا ہے کیا معلوم ان بد معاشوں کو یہ شک پیدا ہو گیا ہو کہ میں نے چلتی لالچ پر سے پانی میں چھلانگ لگادی ہے۔ ان بد معاشوں نے اپنا شگ دور کرنے کی غرض سے کسی ایک بد معاش کو میری تلاش میں ادھر بھیج دیا ہو۔ وہ بھی اپنی لالچ سے چھلانگ لگا کر کنارے پہنچ کر میرے تعاقب میں دوڑتا ہوا آ رہا ہو۔ اس نے پھل نارنج کی روشنی سے یہ جان لیا ہو گا کہ میں سالار ہوں۔ اب میرے لئے ایک نئی مصیبت کھڑی ہو رہی تھی۔

میرے پانی میں شرابو رہنے کی وجہ سے ربوہ لور کی ساری گولیاں بھی بیگ کر بیکار ہو چکی تھیں۔ اب میرے پاس ایک خوفناک قسم کے چاقو کے سودا فاع کے لئے کچھ آواز نہ تھا۔ میں نے اپنی جیب سے چاقو نکال کر اس کا ٹخنہ دبا دیا تو چاقو تھکاک کی آواز کے ساتھ کھل گیا اور اندھیرے میں اس کا پھل جھٹکنے لگا۔ میں چاقو کے دسے پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر کے سامنے والے درخت کی طرف بڑھا۔ اس کے سننے کے پاس پہنچ کر کھڑا ہو گیا پھر میں نے اپنے کان آوازیں سمٹ لگادی۔

رات اور سنانے کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت قریب دوڑ رہا ہو۔ دوسرے لمحے میں نے پھر ایک اور آوازیں نہ یہ کسی اور کے دوڑنے کی آواز تھی۔ یہ بات واضح ہو گئی کہ ایک نہیں بلکہ دو آدمی بڑی تیزی سے اس طرح دوڑ رہے ہیں جیسے کوئی عفریت ان کے تعاقب میں ہو۔ وہ میری تلاش میں نہیں ہیں بلکہ اپنی جان بچانے کی فکر میں ہیں۔

میں درخت کے پاس سے ایک قدم آگے بڑھا اور اس سمت کا اندازہ کرنے لگا جہاں سے ان کے دوڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں دل میں حیران تھا کہ یہ کون لوگ ہیں جو اس گھپ اندھیرے میں اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ آخر یہ بھاگ کر کہاں جا رہے ہیں اور کس لئے بھاگ رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ چور بد معاش ہوں کسی کو لوٹ کر اور قتل کر کے بھاگ رہے ہوں۔ اس طرح سے دوڑنے کا انداز بتاتا رہا تھا ان دونوں نے ضرور کوئی نہ کوئی گتھیں واردات کی ہے اس لئے سریت دوڑ رہے ہیں۔

پھر نضا میں ایک مرد کی آواز گونجی وہ اپنے ہوئے لمبے میں کہ رہا تھا۔ ”میں کتنا..... ہوں رک جاؤ..... ورنہ اچھا نہیں ہو گا..... میں..... میں.....“

معلوم نہیں وہ کس کو دھمکی دے رہا تھا۔ اس کی دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ چند لمحوں کے بعد میں نے ایک نسوانی چیخ سنی۔ وہ ہڈیانی لمبے میں کہ رہی تھی۔ ”مجھے چھوڑ دو

انڈ کہہ کر بائیں طرف پانی میں چھلانگ لگادی۔ میں پانی میں نہ کے بل گر اتو لڑکی طرح گھوم گیا۔ چند لمحوں کے بعد پانی کی سطح پر آیا۔ تبھی ان کی لالچ مجھ سے آگے نکل چکی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ مجھے بائیں میں چھلانگ لگاتے ہوئے نہ دیکھ سکے تھے۔ میں پانی میں تیرتا ہوا کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆-----☆-----☆

بچہ دلش گاؤں ندیوں اور تالوں کا ملک ہے۔ آپ بحری سفر کریں تو بڑا لطف آتا ہے۔ خاص کر آپ دھاکہ سے کھانا جائیں تو راستے میں دو ایک دریا آتے ہیں۔ پھر سارا راستہ آپ ندیوں میں سے گزرتے ہیں۔ آپ ان ندیوں کو چھوئے چھوئے دریاؤں کا نام دے لیں۔ یہ ندیاں سو سے ہزار فٹ چوڑی ہوتی ہیں ایک طرح سے یہ پانی کی سڑکیں معلوم ہوتی ہیں ہزاروں طرف قدم قدم پر آپ کو گاؤں ملیں گے۔ چھوئے چھوئے جزیرے نما گاؤں جو چاروں طرف سے بانیوں میں گھرے نظر آتے ہیں۔ کناروں پر مرد بچے لڑکیاں اور عورتیں آپ کو نہایت برتن اور کپڑے دھوئی اور پانی بھرتی نظر آئیں گی۔ لوگ پھمپھان پکڑتے بھی ملیں گے۔ راستوں میں کشیاں اور لالچیں بھی چلتی اور آتی جاتی ملتی ہیں۔ آپ کو کسی نہ کسی طرف اونچے اونچے درخت اور کھیت دکھائی دیں گے۔

میرا بھی کوئی گاؤں ہو سکتا تھا۔ میں نے کنارے پہنچ کر اس سمت دیکھا جدھر کو لالچیں ملتی تھیں۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ میں نے دور بہت دور گولیاں چنے کی آوازیں سیں۔ چند لمحوں کے بعد یہ آوازیں آہند ہو گئی تھیں۔ پھر مجھے شدید سردی کا احساس ہوا۔ میرے پڑے پوری طرح پانی میں بیگ چکے تھے۔ سرد ہوا میں چل رہی تھیں اور میں کھلی جگہ پر تھا۔ آخر پھر میں پہلے جیسے واقعہ سے دوچار ہوا تھا مجھے پناہ اور کپڑوں کی سخت ضرورت تھی۔ میرا دشمن کی موجودگی کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں جیب سے پھل نارنج نکال کر اس کی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ سریتانے یہ پھل نارنج میرے کپڑوں کو دھوئے اور اسزری کرنے کے بعد قبض کی جیب میں رکھ دیا تھا۔

چاروں طرف گہری خاموشی اور تاریکی چھائی تھی۔ یہ گاؤں تھا کوئی چھوٹا شہر ہی ہوتا تو کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ پر روشنی ہوتی۔ میں نے بمثل نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کیا تھا کہ دفعتاً کسی کے تیز دوڑنے کی آواز گہرے سکوت کا سینہ چرے لگی۔ میں ایک دم سے اوجھل پڑا اور میں نے گھبرا کر فوراً ہی پھل نارنج بھجادی۔ میرے دل میں سب سے پہلے جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ..... کہیں میرے دشمن کا کوئی آدمی میرے تعاقب میں دوڑتا ہوا



نہیں آئی تو تیرا وہ حشر کروں گا کہ تجھے جھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔“  
 ”تو نے مجھے ہاتھ لگایا تو تیرا سر اچھاڑ دوں گی.....“ اس کا لہجہ نفرت اور غصے سے  
 کانپ رہا تھا۔ ”میں موم کی بنی ہوئی نہیں ہوں۔“  
 ”اچھا.....“ وہ استہزائی انداز سے ہنسا۔ پھر ایک ہلکی سی آواز سنائی دی، کس  
 چیز کی آواز تھی میں کبھی نہیں سکا۔ ”یہ دیکھ رہی ہے میرے ہاتھ میں کیا ہے؟“  
 ”تو مجھے چاقو سے ڈرا رہا ہے گیڈنے کی اولاد..... میں موت سے نہیں ڈرتی۔  
 اس جینے سے مر جانا بہتر ہے۔“

میں اصل معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ ایک غیبت مراد کا معصوم اور جوان لڑکی  
 کی مجبور رہی ہے فائدہ اٹھا کر اسے شکار کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس دنیا میں ایسے شکار یوں کی  
 کوئی کمی نہیں تھی۔ ایک لڑکی دروندے کے سامنے اپنی عزت بچانے کے لئے ڈنی ہوئی  
 تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر بڑے زور سے دھک دی۔ گھر کے اندر ایک دم  
 سے سناٹا چھا گیا۔ مرد جس کا نام کلاشی تھا اس کی تیز دند آواز گونجی تو وہ مرتعش سی تھی۔  
 ”کون.....؟ کون ہے؟“

”میں پولیس انسپکٹر ہوں۔“ میں نے کرخٹ لمبے میں جواب دیا۔ ”فورا دروازہ  
 کھولو.....“

”کون پولیس انسپکٹر.....؟“ کلاشی کی آواز سے گھبراہٹ نمایاں تھی۔ ”تم

کہاں سے آگئے۔ اس گاؤں میں کوئی پولیس افسر نہیں رہتا۔“

”میں ڈھاکا سے آیا ہوں تحقیقات کرنے کے لئے.....“ میں نے اس پر رعب

ڈالا۔ ”گاؤں والوں نے تمہاری شکایت کی ہے۔“

”میں کسی پولیس انسپکٹر ویکٹر کو نہیں جانتا۔“ وہ شیر ہو گیا۔ ”میں رات کے وقت

اپنے باپ سے بھی نہیں ملتا مگر صبح آ جانا.....“

میں اس کی ڈھٹائی پر حیران رہ گیا۔ گاؤں کے لوگ کیا بلکہ گاؤں کے بد معاش بھی

پولیس کے نام سے گھبراتے اور خوف کھاتے تھے۔ یہ تو کوئی چمٹا ہوا بد معاش لگ رہا تھا۔

اس کے جواب نے مجھے کھولا دیا۔

”دروازہ کھولتے ہو کہ نہیں غیبت آدمی.....“ میں نے دروازہ پینٹے ہوئے

..... کیمنے..... ذلیل..... میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ ارٹ  
 ..... تھو..... اس نے شاید مرد کے منہ پر تھوک دیا۔

”تو کیسے نہیں جائے گی..... میں نے تیری ماں کو ناکا دیئے ہیں۔ اب تو میری  
 ہے.....“ مرد سخت لمبے میں بولا۔

پھر میں نے لڑکی کی آوازیں سنیں۔ وہ چچ چچ کر ساتھ جانے سے انکار کر رہی تھی۔  
 اسے گالیاں دے رہی تھی۔ مرد نے شاید اسے گود میں اٹھالیا تھا یا پھر اسے کھینچا ہوا ساتھ  
 لئے جا رہا تھا تھوڑی دیر کے بعد اس کی آواز زور و زور کرنا شروع ہو کر رہ گئی۔

ایک بات میری سمجھ میں جو آئی وہ یہ تھی کہ اس لڑکی کو اس کی ماں نے ایک رقم کے  
 عوض شادی کے لئے بیچ دیا ہو گا۔ وہ اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہو گا۔ لڑکی کو یہ مرد پند  
 نہیں آیا ہو گا۔ وہ کوئی بوزھا اور عیاش قسم کا مرد ہو گا اس لئے لڑکی اس سے شادی کرنا  
 نہیں چاہتی ہو گی اور اس لئے بھاگ کر کہیں جا رہی ہو گی۔ اس مرد نے تعاقب کر کے اسے  
 پکڑ لیا اور اب اسے اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا۔

میں نے چاقو بند کر کے جب میں رکھ لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چل پڑا۔ اس لئے  
 کہ کپڑے بدن سے پکے ہوئے تھے اور سردی بھی لگ رہی تھی۔ کوئی پند رہا میں منٹ چلنے  
 کے بعد مجھے ایک مکان نظر آیا جو لال اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ اس مکان میں سے تیز تیز باتیں  
 کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میری مارچ کی روشنی نے مجھے اس مکان کے دروازے پر  
 جاکھڑا کیا۔ یہ دو کمروں کا مکان تھا۔

”میں مرد جاؤں گی..... خود کشتی کر لوں گی..... تیرے ساتھ نہیں چلوں گی“

..... تیری بات نہیں مانوں گی۔“ یہ آواز اس لڑکی کی تھی جو میں نے کچھ دیر پہلے سنی

تھی۔ لڑکی کی آواز تیز و تند تھی۔ وہ نفرت اور غصے سے کہہ رہی تھی۔ ”میں تیرا خون پی

جاؤں گی۔“

وہ مرد ہنسنے لگا۔ ”تو مجھ سے کتنی باری لگتی ہے..... اسی لئے تو میں نے تیری

ماں کو اچھی رقم دی ہے۔ میرا نام کلاشی ہے۔ بڑے بڑے بد معاش میرے نام سے کاپٹے

ہیں..... تو کیا میرا خون پئے گی۔“

”میں کتنی بوس ڈھٹ جا میرے راستے سے.....“ وہ ہڈیانی انداز سے بولی۔

”دیکھ نیلو کی بیٹی.....“ مرد کسی کتے کی مانند غرا ہوا تھا۔ ”تو نے ایک گھٹنے سے

میری جان عذاب کر رکھی ہے۔ اچھی طرح سے سن لے اگر تو سیدھی طرح راہ راست پر



”نہیں.....“ اس نے بھی بڑی دھڑائی سے جواب دیا۔ ”تمہارا باپ بھی آجائے تو دروازہ نہیں کھولوں گا۔“ میں نے پھل نارنج سے دروازے پر روشنی ڈالی۔ دروازہ اس قدر مضبوط نہیں تھا پہلے تو میں نے دروازے پر ایک لات رسیدی۔ دروازہ ہل کر رہ گیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ ایک زوردار دھکے کی ضرورت ہے۔ میں دو تین قدم پیچھے ہٹا۔ بھاگتا ہوا آیا اور گندے سے دروازے کو دھکادیا۔ دروازہ اپنے قبضوں سمیت فرش پر آ رہا۔..... میں نے اپنا توازن برقرار رکھا۔ میں توازن برقرار نہ رکھتا تو دروازہ سمیت فرش پر آ رہتا۔

کمرے میں ایک بہت بڑی لائین چل رہی تھی۔ اس کی تیز روشنی کمرے میں بھیلی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے میری نظریں ایک جوان لڑکی پر پڑیں جس کی عمر بشل چند سو برس کی ہوگی۔ وہ ایک حسین اور بھرپور لڑکی تھی اور مجھے متوش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف چھایا ہوا تھا۔ وہ دیوار سے لگی سی اور پریشان کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر روشنی آگئی۔ میں ہنست ہنست کے سفاری سوٹ میں لبوس تھا اس لئے اس نے مجھے پولیس انسپکٹر سمجھ لیا تھا۔ وہ میری طرف پلک کر آئی۔

”انسپکٹر صاحب! مجھے اس شیطان سے بچا لیجئے..... یہ مجھے زبردستی گھر سے اٹھا کر لایا ہے۔“ وہ گونگڑا لے گئی۔

”بھوت بکلی ہے۔“ مرد بڑا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک لمبا ترنگا اور مضبوط جسم کا آدمی تھا بنگالیوں میں ایسے لمبے قد کے مرد ہزاروں میں ایک دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سوراہی تھیں۔ ان سے خفاست بھجاک رہی تھی اور چہرے پر سفاکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ دیکھنے میں ایک نمبر کینہ اور غیبت لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانا سا پھرا تھا۔

”بھوت تم بول رہے ہو۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”تمہیں شرم نہیں آئی ایک غریب لڑکی کو اس کے گھر سے اٹھا کر لائے ہوئے۔“

”اس کی ماں کو میں نے سوٹا کا دے کر اسے خرید لیا ہے۔“

”سوٹا.....؟“ میرے اندر نفرت، غصے اور دھک کا ایک ریل اٹھا۔ ”ایک انسان کی قیمت صرف سوٹا..... کیا یہ لڑکی صرف سوٹا کی ہے۔“

”انسپکٹر صاحب!“ وہ متحسرے ہوا۔ ”سوٹا کا میں نے پھر بھی بہت دیئے ہیں۔ یہاں انسان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ انسان تو جانور سے بھی سستا ہے۔“

”یہ تم جیسے کتوں کے نزدیک انسان جانوروں سے بھی سستا ہوگا۔“ میں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ پھر میں نے لڑکی کی طرف گھوم کر پوچھا۔ ”سچ بتانا..... کیا اس نے تمہاری ماں سے تمہیں سوٹا کا میں خریدا ہے۔“

اس لڑکی نے اپنا سر اور اپنی نظریں نیچی کر کے سر ہلایا۔ ”جی انسپکٹر صاحب! یہ کاشفی ٹیک کہتا ہے۔“

میں نے اپنی جیب سے بڑھ نکال کر اس میں سوٹا کا ایک نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ سوٹا کا..... اسے اپنے گھر جانے دو.....“

”مگر میں تو اسے سوٹا کا میں نہیں بچ رہا ہوں۔“ اس نے میرے ہاتھ سے نوٹ نہیں لیا۔ ”اب یہ میرا مال ہے اب میری مرضی اسے اپنے یا نہ بیچوں۔“

”یہ کوئی جانور نہیں ہے یہ ایک شریف لڑکی ہے۔“ مجھے اس کا جواب سن کر غصہ آ گیا۔

”یہ جو بھی ہے میری ملکیت ہے آپ مجھے اسے سوٹا کا میں بیچنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔“ وہ اکر تاجا رہا تھا۔

”تمہیں اس کی کتنی قیمت چاہئے؟ سو دو سو تین سو چار سوٹا کا.....“ میں اپنے بڑے سے سوٹا کا کے نوٹ نکال لے گا۔

”میں تو صاحب اسے دس ہزار سوٹا کا میں بھی نہیں بیچوں گا۔ آپ اپنی راہ لیں مجھے پولیس انسپکٹر بہن کر ڈرائیں دھمکائیں نہیں۔“

”اسے تم کیوں نہیں بیچو گے.....؟“ میری رگوں میں لہو اٹھنے لگا۔ میں نے جیب میں بڑا کر کے اسے گھورا۔

”اس لئے کہ میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ اسے اپنی لے جاؤں گا۔ وہاں دس چند ہزار سوٹا کا میں بیچوں گا۔ بیچنے سے پہلے دس چند ہزار کا کا کدہ بھی اٹھاؤں گا..... یہ بہرا ہے بہرا..... اس کی مجھے بہت اچھی قیمت ملے گی۔“

”اب تمہیں سوٹا کا تو کیا ایک کوڑی بھی نہیں ملے گی..... میں اس لڑکی کو اس کے گھر لے جا رہا ہوں تم میرا راستہ روک سکتے ہو تو روک لو.....“

”کیوں اس لڑکی کے پیچھے آپ اپنی موت کو دھوکا دے رہے ہیں..... شاید آپ مجھے نہیں جانتے ہیں؟ میرا نام کاشفی ہے۔ میرے نام کا لڑکا صرف اس علاقے میں ہی نہیں کھانا لے کر نکلتا ہے جتنا ہے۔ بڑے بڑے بد معاش میرا نام سن کر قہر جاتے

قوت سے میرا گلا گھونٹ دینا چاہتا تھا۔ میرا دم تھا کہ گھنٹا جا رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ اچانک اس نے میرا گلا چھوڑ دیا۔ ایک دلدوز بچہ مار کے وہ لڑکی کی طرف چلتا۔ اس لڑکی نے میری جان پچائی تھی۔ اس نے کمرے میں رہ گئے ایک ڈنڈے کو اٹھا کر اس کے کندھے پر دے مارا تھا۔ وہ دروہی تاب نہ لاسکا اور میری گردن چھوڑ دی تھی۔

وہ لڑکی کے پاس جا کر ڈنڈا چھیننے کی کوشش کرنے لگا تو میں نے لپک کر اسے پیچھے سے اپنے بازوؤں کے شیعے میں کس لیا۔ اب ہم دونوں میں ایک ایسی کشش شروع ہو گئی تھی جو کسی ایک کی موت پر ختم ہو سکتی تھی۔ لڑکی نے وہ ڈنڈا اٹھا لیا جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا تھا۔ اس نے ڈنڈا اٹھا کر اتنے زور سے کلا فاشی کی ٹانگ پر دے مارا کہ دروازے سے اس کی چیخ نکل گئی۔ میں نے لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یلو! تم ایک طرف ہو جاؤ۔“ اس کتے کے بچے سے میں خود ہی منٹ لوں گا۔ اسے ایسا سبق سکھائوں گا کہ یہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔“

نیلو تیزی سے دو قدم پیچھے ہٹ کر ایک طرف ہو گئی تو میں نے اسے برقی رفتار سے اپنے بازوؤں کی قید سے الگ کیا اور بغیر کسی تاخیر کے اسے تنے زور سے دیوار کی طرف دھکا دیا کہ وہ کسی سنناٹا ہونی گولی کی طرح دیوار سے جکڑ گیا۔ اس کا سارا جسم ہی نہیں بیچا بھی بل کر رہ گیا ہو گا۔ وہ ایک گیندے کی طرح تھا اس لئے وہ اتنی بڑی چوٹ سہہ گیا اور اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ سنبھل کر سرعت سے میری طرف گھوما تو میں نے دیکھا اس کی ٹانگ اور منہ سے خون نکل رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح سنبھلا اور مجھ پر بل پڑتا میں نے اس کی کینٹ پر جوڑو کے دو تین ہاتھ مارے وہ جیسے ہی فرش پر کسی کتے ہوئے شیر کی طرح گر ایں نے ہاتھوں سے اس کی خاطر طوابع کرنا شروع کر دی۔ جب اس نے اپنے آپ کو بے بس اور میرے رحم و کرم پر بایا تو تڑنڈا نے لگا۔ پھر اس نے ہاتھ جوڑے اور خوشامدیں کیں تو میں نے اسے بخش دیا اس لئے کہ میں نے اس کی جو درگت بنائی تھی وہ اس کے لئے بہت کافی تھی۔ وہ دو ایک دن تک چلے بھرنے کے قابل نہیں رہا تھا اور پھر وہ نہ صرف بری طرح کراہ بھی رہا تھا بلکہ اس کی ٹانگ اور منہ سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔

میں ٹوٹے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا میں نے دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے اٹھایا تاکہ اسے دیوار سے لگا کر کھڑا کر دوں میں نے دروازے کو کھڑا کیا یہی تھا کہ

ہیں۔ پولیس والے میرے آگے پیچھے کتوں کی طرح دم ہلاتے پھرتے ہیں آپ بھلا کیا چیز ہیں.....؟“

کاش! تم نے بھی میرا نام سنا ہو؟..... میں تیسرے درجے کے کینوں کو منہ نہیں لگاتا ہوں۔“ میں نے پلٹ کر لڑکی کا بازو پکڑا۔ ”چلو نیلو..... میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں.....“

غیر جاؤ.....“ وہ اپنی پوری قوت سے دھاڑا۔ وہ چھرا لہراتا ہوا نظروں کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ ”کیا تم نے مجھے سمجھ رکھا ہے؟“

میں اس کے تپلے کا شہر تھا۔ کلا فاشی سے مقابلہ آسان نہیں تھا وہ ایک چھٹا ہوا بد معاش تھا۔ جس انداز سے اس نے ہاتھ میں چھرا پکڑ رکھا تھا اس سے اس کی مشاقی کا پتا چلتا تھا۔ یہ ایک ظالم شخص تھا۔ اس حیثیت سے شکست کھانے کا مطلب یہ تھا کہ میں زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔ وہ میری طرف جس تیزی سے چھرا اٹھاتا ہوا اچھٹا میں اس سے کہیں تیزی کے ساتھ ایک طرف ہٹ گیا اور دائیں ہاتھ سے ایک گھونسا اس کی پٹلی میں مارا تو دوسرے لمبے وہ فرش پر خاک چاٹ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی پٹلی میں جوتے سے ایک ٹھوک لگائی تو وہ دروہے بلبارک ہوا گیا لیکن سرعت سے کھڑا ہو گیا۔ فیسے اور دروہی شدت سے اس کا چہرہ لالہ سمجھ کا ہو رہا تھا۔ اس نے چھرا میری طرف پھینکا۔ اگر میں تیزی سے جھپک نہیں جاتا تو وہ چھرا میرے سینے میں دل کی جگہ کڑی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند ہیست ہو جاتا۔ اس کا درخانی چوکیا تو اسے اور غصہ آ گیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے اور اب نیتے تھے۔ اب میری باری تھی جیب سے چاقو نکالنے کی، میں یوں تو دیوار اور بھی نکال کر اسے قابو میں کر سکتا تھا مگر اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ میں اس کی ایسی درگت بنانا چاہتا تھا کہ وہ تین دن تک بہتر سے نہ اٹھ سکے اور پھر کسی لڑکی کو خریدنے کی ہمت نہ کرے۔ وہ مجھے اپنی سوز آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ وہ آدمی نہیں ناگ کی طرح لگ رہا تھا۔ اس کے تیور بڑے خطرناک تھے۔

وہ غرا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کی حالت چوٹ کھانے ناگ کی سی تھی۔ اس پر جنون سا سوار تھا اس لئے پوری طرح اپنے اوسان میں نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ میرے منہ پر پڑتا میں نے اس کی ٹانگ پر ایک گھونسا چڑیا۔ وہ ایک دم مجھ سے چپٹ گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے میرا گلا پکڑ کے رہا۔ لگا۔ میں نے اس کے ہاتھوں سے گردن چھرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس کے ہاتھوں میں بڑی طاقت تھی اور وہ اپنی پوری

نیلو نے ایک دم سے بڑے زور کی چیخ ماری۔ ”انسپکٹر صاحب!..... بچے.....“

میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا تو میری ریزہ کی ہڈی میں ایک سرد لہر اترتی چلی گئی۔ وہ غیبت چھرا لے کر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے چھرا کے کاخیال نہیں کیا۔ چھرا اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ میرا یہ خیال درست ثابت نہیں ہوا تھا کہ وہ لٹنے پٹنے کے قابل نہیں رہا۔ اگلے لمحے ذرا بھی اندازہ ہو تا کہ وہ اتنا تختہ جان ہو گا تو میں اس کی اور حرمت کر دیتا۔ اس کے سر پر جیسے انتقام کا جنون سوار ہو گیا تھا اور وہ اپنی پوری طاقت مجتمع کر کے میرے چھرا گھونپنے کے لئے آ رہا تھا۔ اگر وہ دردناکیت سے بے جان سانس نہیں ہو رہا ہو تا تو اب تک مجھ پر برقی گرفتاری سے حملہ آور ہو چکا ہو تا اور وہ چھرا میرے جسم میں اتر جاتا۔ میں نے دردناکے کو جلدی سے فرش پر گر ادا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی اور اس نے مجھے جیسے گھیر لیا تھا۔ مجھے اس نے سینٹھلے اور بچاؤ کی مصلحت بھی نہیں دی۔ میرے سینے پر اپنے خوفناک چھرا کی نوک رکھ دی تو میں دیوار سے لگ کر کھڑ ہو گیا۔

اب میں بے بس اور اس کے رحم و کرم پر تھا۔ ساری بازی الٹ چکی تھی مجھے اپنی نظروں کے سامنے موت کا فرشتہ کھڑا نظر آ رہا تھا۔ وہ کسی صورت میں مجھ بخشنے سے رہا تھا۔ اس کی لال لال آنکھوں میں دردنگی اتر آئی تھی اور چہرے پر سفاکی تھی۔ میں اپنی جگہ سے جنبش بھی کر تا تو چھرا کی نوک میرے سینے میں اتر جاتی۔ چھرا کی نوک کی چھبیں سے میرے سینے میں تکلیف ہو رہی تھی میں اسے چھرا ہٹانے کے لئے کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ بھی تو وہ اور چھوٹا۔ میں تکلیف برداشت کئے خاموشی سے کھڑا رہا۔

”اب کو پانی کی اولاد.....“ اس کی سانس اس کے سینے میں دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اس کا چہرہ اور آنکھیں کسی جلاد کی طرح لک رہی تھیں۔ ”تم نے میری جان لینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رہی تھی۔ اب میں تمہاری جان لوں گا میں اس چھرا سے اب تک تم جیسے ہر دی کرنے والے کی لوگوں کو اس دنیا سے رخصت کر چکا ہوں۔“

”اگر تم سے مجھے کسی قسم کا نقصان پہنچا تو یاد رکھو..... تم خود بھی بچ نہیں سکو گے.....“ میں نے نفیاتی حربہ آزمائے کی کوشش کی۔ اس لئے میرے پاس وفارہ کے لئے ایک ہی ہتھیار تھا۔ اس سے میری جان بھی بچ سکتی تھی۔

”میں کیسے بچ نہیں سکا.....“ اس نے مجھے گھورا۔ ”کیا تمہارے فرشتے مجھ سے تمہاری موت کا بدلہ لیں گے۔“

”فرشتے نہیں پولیس.....“ یہ دھمکی میرے لئے دلدل میں تنگے کا سمارا تھی۔ ”میں پولیس کا آدمی ہوں پولیس کے آدمی پر حملہ کرنا یا اسے قتل کرنا تب بڑا جرم ہے۔ پولیس تمہیں پھانسی پر لٹکا دے گی.....“

”میں جانتا ہوں کہ تم پولیس والے نہیں ہو اور مجھے خواہ خواہ ڈرا رہے ہو۔“ وہ حقارت سے بولا۔ ”کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تم پولیس کے آدمی ہو۔“

”میاں کے تھانے والوں سے تمہیں ثبوت مل جائے گا۔ تم کسی بھی پولیس والے سے پوچھ کر دیکھ لو۔“

”تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو میں خود پولیس میں دس بارہ برس ملازم رہ چکا ہوں۔“ اس نے دوسرے ہاتھ سے میرا گردن پکڑ لیا۔ ”تمہارے کیلے کپڑے بتا رہے ہیں کہ تم کوئی مجرم ہو یا سینئر ایلاچ سے پانی کی شکر اور اسی جان بچانے آئے آئے ہو۔“ وہ اپنا ہاتھ میرے دالا ہاتھ پیچھے سے گیا تاکہ میرے سینے میں چھرا گھونپ سکے لیکن مجھ اس کا ہاتھ حرکت نہ کر سکا میرے گردن پر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور مجھ اس کے ہاتھ سے چھرا چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ وہ لڑکھاتا ہوا پیکر اتنا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے گرتے ہی نیلو پوری قوت سے اس کے ہاتھ بیروں پر ڈنڈے سے ضربیں لگائے گئی یہ نیلو تھی جس نے میں وقت پر کالافشی کے سر پر ڈنڈا مارا تھا۔ اگر اس سے ایک پل کی بھی تاخیر ہو جاتی تو میری انٹزیاں باہر آچکی ہوتیں۔

میں نے لپک کر نیلو کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا۔ اس پر تو جیسے جنون سوار ہو گیا تھا اس نے نہ صرف کالافشی کا سر پھاڑ دیا تھا بلکہ اس کے ہاتھ پر کی ہڈیاں بھی توڑ کے رکھ دی تھیں وہ اس کے جسم کی ایک ایک ہڈی پکڑ کر دینا چاہتا تھی وہ میرے ہاتھ سے ڈنڈا چھیننے لگی۔ ”انسپکٹر صاحب! مجھے یہ ڈنڈا دے دیں..... میں اس کے ہاتھ پیر توڑ دیتا ہوں ہوں تاکہ یہ کسی لڑکی کو خرید نہ سکے۔ اسے لے کر نہ جاسکے۔“

”تم نے اس کا سر پھاڑ دیا ہے ہو سکتا ہے اب وہ زندہ نہ بچ سکے..... چلو.....“

”میں مر جائے گا.....“ نیلو کا چہرہ دکھ اٹھا۔ ”خدا کرے یہ مر جائے یہ کینہ ہمارے گاؤں کی بہت ساری لڑکیوں کو خرید کر پاکستان میں بیچ آیا ہے۔ ان لڑکیوں کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ ان لڑکیوں کی مائیں اس کی موت کی دعائیں مانگتی رہتی ہیں۔ آج ان کی دعائیں قبول ہو گئیں۔“

الم ناک کمائی خانے کے بعد کما کہ وہ دونوں آج بھی صبح سے فاقے ہیں۔  
اس وقت گھر میں کچھ نہ تھا۔ نیلوی ماں سوٹا کا وہ نوٹ لے کر جو کلاشٹی نے نیلو کے عوض دیا تھا سودی (پروچن کی دکان) کی دکان والے سے چائے کی پتی اور شکر خرید کر لانے چلی گئی تھوڑی دیر کے بعد وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں دودھ اور بکٹ بھی تھے نیلو نے چائے پائی۔ میں نے صرف چائے پی لی یاں بیٹی نے سارے بکٹ ختم کر دیئے۔ میں نے نہیں بہت مختصر طور پر یہ بتایا کہ مجھے کچھ بد معاشوں نے جان سے مارنے کی کوشش کی تو میں نے پانی میں چھلا نکا لگا کر اپنی جان بچائی۔ نیلو کی ماں نے بتایا کہ صرف پیر کی رات آٹھ بجے ایک لالچ آئی ہے جو چاند پور سے روانہ ہوتی ہے اور یہاں اناج وغیرہ اتار کر ڈھاکا چلی جاتی ہے۔ پہلے یہاں دن اور رات کو کچھ سات لالچیں آتی تھیں اب دن میں صرف دو لالچیں آتی ہیں اس لئے کہ اکثر لالچیں جو اناج اور غلے کی ہوتی ہیں دو ایک دن کے لئے پراسرار طور پر لاپے ہو جاتی ہیں پھر وہ خالی ملتی ہیں ان میں نہ تو آدی ہوتے ہیں نہ غلہ ہوتا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ جنت آدیوں اور اناج کو غائب کر دیتے ہیں اور کسی جزیرے پر جنت کا سیرا ہے یہ وہ حرکت کرتے ہیں۔ اس وجہ سے سارے گاؤں میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا اور یہ طرح طرح کے قصے کہانیاں مشہور تھیں۔ اتفاق سے آج اتوار کا دن تھا۔

نیلو نے میرے لئے ایک کمرے میں بست لگا دیا۔ وہ دونوں دوسرے کمرے میں جا کر سو گئیں۔ میں ساری رات بڑے آرام سے سویا۔ صبح مجھے نیلو نے جگا یا میں نے ان دونوں کو سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ کسی کو بھی میرے بارے میں ہوا تک نہ لگتے دیں۔ پھر میں نے نیلو کی ماں کو دو سوٹا گادے تاکہ وہ ناشتے اور سارے دن کے لئے کھانے کا بندہ دست کرے۔ وہ جا کر راشن، مچھلی اور دو مرغیاں، دو دھ دی اٹڑے اور مٹھائی بھی لیتی آئی۔ ماں بیٹی نے مل کر جلدی سے پُر تکلف ناشتہ تیار کیا اور پڑاٹھے سوٹی کا ملوہ اور دھ تھا وہ دونوں غریب اس ناشتے پر نوٹ پڑی تھیں۔ دوسرے کھانے میں مچھلی کا سالن بھات اور فرانی مچھلی بھی تھی۔ سالن برا مزیدار اور ذائقہ دار تھا۔ میں نے شام تک کا وقت ان سے باتیں کر کے اور چائے پیتے ہوئے گزارا۔ رات کے کھانے کے لئے وہ دونوں مرغیاں ذبح کر دیا جانتی تھیں۔ میں نے منع کیا صرف ایک مرغی ذبح کی سات بجے رات کا کھانا تیار تھا نیلو نے مرغی بلاؤ پکا یا تھا جو بہت عمدہ تھا۔

ماڑھے سات بجے لالچ کے سارن کی آواز سنائی دی نیلو نے بتایا کہ وہ آدے سمٹنے تک سامان اتارنے کے لئے رکتی ہے۔ میں نے اپنے کپڑے پہنے اور جب سے بڑا نکالا یہ

ہم دونوں اس جگہ سے نکل کر ایک بٹڈی پڑ چلے گئے۔ میں نے نیلو سے کہا۔ ”تم نے آج میری دو مرتبہ جان بچائی..... میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکوں گا.....“ تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“  
”آپ تو میرے لئے فرشتہ ثابت ہوئے۔“ وہ کہنے لگی۔ ”خدا نے آپ کو میرے لئے فرشتہ بنا کر بھیجا۔ آپ نہ آتے تو میرے پاس کچھ بھی نہ ہوتا آپ نے میری خاطر اپنی جان تک خطرے میں ڈال دی۔ میں سو مرتبہ بھی آپ کی جان بچاؤں تو آپ کا یہ احسان نہ اترے۔“

یہ ایک دہائی اور معصوم لڑکی تھی لیکن اس کی باتیں بڑی گہری تھیں۔ وہ اندھیرے میں میرا ہاتھ پکڑے اپنے گھر کی طرف چلتی رہی کوئی میں منٹ کی مسافت کے بعد نیلو کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو اس کی ماں جاگ رہی تھی اور اپنے نصیبوں کو رو رہی تھی۔ رو رہ کر اس نے اپنی آنکھیں سجائی تھیں۔ وہ مجھے نیلو کے ساتھ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی اور اس نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا کلاشٹی نے تمہیں ان کے ہاتھ بچ دیا ہے۔“

”نہیں ماں.....“ وہ ماں کے سینے سے لگ کر سسک پڑی۔ ”یہ انیسٹر صاحب ہیں انہوں نے نہ صرف میری عزت بچائی ہے بلکہ نئی زندگی دی ہے۔“ نیلو نے اپنی ماں کو مختصر طور پر سارے حالات سے آگاہ کیا۔ پھر اس نے ایک کپڑوں کی ٹھہری میں سے ایک مردانہ جوڑا نکال کر مجھے پہننے کے لئے دیا۔ اس کا ایک بھائی تھا جو اپنی شادی کے بعد اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ڈھاکا شہر چلا گیا تھا۔ تب سے وہ وہیں تھا اور اس نے بھی بھول کر اپنی ماں اور بہن کی کوئی خبر نہیں لی تھی اور نہ ہی ان کے اخراجات کے لئے کوئی رقم روانہ کی تھی اس روز سے ماں بیٹی مسرت اور غلغلہ کی زندگی گزار رہی تھیں۔ فاقوں کی نوبت تک آگئی تھی۔ کلاشٹی کراچی میں لڑکیوں اور جووانی عورتوں کو ملازمت دلوانے کے بنانے خرید کر یا سبز یاغ دکھا کر لے جاتا تھا۔ یہ لڑکیاں اور عورتیں اس لئے چلی جاتی تھیں کہ وہ غریب یا بے سارا ہوتی تھیں اور انہیں ایک وقت بھی کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ نیلو کی ماں نے بھی مفلسی غلغلہ سے تنگ آ کر اپنی بیٹی کو اس غیبت کے ہاتھ سوٹا میں بچ دیا تھا کہ کم از کم اس کی بیوی کو نہیں رہے گی کہیں بھی جائے گی، کسی حال میں بھی رہے گی اسے دو وقت پیٹ بھر کے کھانے کو تو مل جائے گا۔ نیلو کو ایک ماں نے نہیں بچا تھا غربت و افلاس اور اس کی مجبوری نے بچا تھا۔ یہ سودا نیلو کی مرضی کے خلاف ہوا تھا اور وہ کسی قیمت پر کلاشٹی کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی۔ کلاشٹی اسے زبردستی ساتھ لے گیا تھا۔ نیلو کی ماں نے یہ ساری



یہ کارگو لالچ تھی اس پر راشن کی بہت ساری بوئیاں لدی ہوئی تھیں۔ لالچ کے ایک ملازم نے بتایا کہ یہ راشن دو ایک گاؤں میں اتار کے ڈھاکا جائیں گے۔ اس لالچ میں مسافروں کے لئے عرشے پر ایک کمرہ سنا ہوا تھا۔ اس کمرے میں کوئی آٹھ دس مسافر بھی تھے۔ ان میں دو جوان لڑکیاں اور ایک عورت تھی۔ یہ سارے مسافر کسی گاؤں کے تھے جو راستے میں پڑا تھا۔

لالچ میں ایک چھوٹا سا ریٹورنٹ بھی تھا۔ میں نے اپنے اوپر نرم سفروں کے لئے چائے منگوائی۔ ان لوگوں نے بڑی ممنونیت سے میری چائے قبول کر لی اور سیاست کے موضوع پر باتیں کرنے لگے۔ چائے پینے کے تھوڑی دیر کے بعد میں نے ایک آواز سی تھی تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ کسی لالچ یا اسٹیر کے انجن کی آواز سی گئی۔ میں عرشے پر آیا تو میں نے ایک تیز رفتار لالچ کو مخالف سمت سے آتے دیکھا۔ کیا کروں میری سمجھ میں نہیں آیا اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ ہماری لالچ کو روک کر اس کی تلاش لیں گے۔ اس کی تلاش لینے کا مقصد مجھے بے زیاں پر کتنا تھا پھر اس لالچ کو اغوا کر کے لے جانا بھی ہو سکتا تھا۔ اب تو فراہم کی راہ بھی نہیں رہی تھی اس لئے کہ وہ لالچ قریب ہوتی جاری تھی اور اس کی رفتار میں بھی کمی ہونے لگی تھی۔ لاؤڈ اسپیکر پر لالچ کو روکنے کا حکم دیا جاتا تھا۔

میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی تو میں نے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو لالچ کی ان بوئیوں کے درمیان جو عرشے پر رکھی تھیں چھپا لیا یاں ایک بہت بڑا خلا تھا۔ میں نے ایک بوئی کو اس طرح کھسکا کہ ادھر روشنی پڑنے پر بھی میں نظر نہیں آسکتا تھا۔ یہ بوئیاں لالچ کے عقبی سرے پر رکھی تھیں اور ادھر گھپ اندھیرا بھی تھا۔ اس طرح میں سب کی نظروں سے پوری طرح محفوظ ہو گیا تھا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ لالچ کے رکتے ہی اس لالچ سے شاید چھ سات مسلح افراد ہماری اس لالچ پر آ گئے۔ ان کی آوازوں اور باتوں سے پتہ چل گیا کہ انہوں نے نہ صرف اس لالچ پر قبضہ کر لیا بلکہ اس لالچ پر سوار تمام مسافروں اور عملے کو نیچے لے جا کر قید کر دیا تھا۔ عورتوں نے چیخا پلانا شروع کیا تو انہیں ڈانٹا اور جان سے مارنے کی دھمکی دینا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد لالچ نے دشمن کی لالچ کے پیچھے پیچھے اپنا سفر شروع کر دیا۔ اس کے تھوڑی دیر کے بعد دو مسلح معاش ان بوئیوں کے ڈھیر کے پاس آکر جہاں میں لیٹا تھا پھول کی ایک بوڑی پر بیٹھ گئے۔

وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے تھیرا آمیز لہجے میں کہا۔

بڑا جعفر کا تھا اس میں چھ ہزار ٹاکا کی رقم تھی۔ میں نے اس میں سے چار ہزار ٹاکا کی رقم نکال کر ان کی طرف بڑھا دی تو بائیں نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ غریب تھیں لیکن ان کا دل بڑا تھا اور خوبصورت بھی تھا۔ میرے بہت مجبور کرنے پر انہوں نے رقم لے لی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ اس رقم سے گاؤں میں کوئی کاروبار کر لیں۔

وہ دونوں مجھے رخصت کرنے گھاٹ سے ڈرافٹل تک آئی تھیں اور ایسے راستے سے لے گئی تھیں کہ کسی کی جھجھک نظر نہ پڑ سکے۔ نیلے راستے میں بتایا تھا کہ سپر کے وقت کلاشکی کا ایک آدمی اس کے ہاں گیا تو وہ بے ہوش پڑا تھا اسے بے ہوش کی حالت میں کشتی میں ڈال کر نروپ دے جایا گیا جہاں ایک سرکاری ڈپنری واقع ہے دیسے اب کالا کشتی کا ہوش میں آنا مشکل تھا۔

لالچ کی روانگی پہلے جب چاب سات منٹ باقی رہ گئے تو میں نے ان دونوں کو خدا حافظ کہا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ نیلو بہت زیادہ جذباتی ہو رہی تھی اور ساڑھی کے پلو میں نہ چھپا کر سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس سے میرا ایک گمراہ اور جذباتی سارشت ہو گیا تھا جو تمام رشتوں پر بھاری تھا۔ اس رشتے کی پاکیزگی نے اس سے قریب کر دیا تھا۔ میں نے نیلو کے آنسوؤں کو پونچھا اور اس کے سر پر شفقت سے اس طرح سے ہاتھ بھیرا جیسے وہ کوئی میری چھوٹی بہن ہو۔ پھر میں تیزی سے لالچ کی طرف لپک گیا اس وقت سیزم ٹکالنے کی تیاری کی جارہی تھی۔ میرے عرشے پر قدم رکھتے ہی سیزم ہٹا دی گئی۔ گھاٹ پر موجود گاؤں کے باشندوں نے مجھے جرت سے دیکھا اس لئے کہ میں ان لوگوں کے لئے انجینی تھا اور گاؤں والوں کو شاید اس لئے بھی تعجب ہو رہا ہو گا کہ میں انہیں دن میں دکھائی نہیں دیا تھا۔

جب لالچ روانہ ہوئی تو میں عرشے پر تھوڑی دیر تک کھڑا اس گاؤں کی طرف اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ اس گاؤں سے میری کچھ یادیں وابستہ ہو گئی تھیں۔ نیلو نے میرے دل پر گہرا نقش چھوڑا تھا جس سے ساری زندگی بھول نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ وہ نہ صرف میری محسن تھی بلکہ ایک بہادر اور عظیم لڑکی بھی تھی جس نے بھوک، غربت و افلاس اور حالات کے سامنے کھٹے کھٹے کے بجائے ان کا مقابلہ کیا تھا۔ اس دیش میں کیا ساری دنیا میں بہت کم غریب اور فائدہ نواز لڑکیاں اور عورتیں حالات سے لڑتی تھیں اور وہ مجبور یوں کا شکار ہو جاتی تھیں۔ سب سے عظیم بات بھوک سے لڑنا تھا۔



دو چار ہونا پڑے گا مگر خدا کا شکر ہے کہ وہ پھر نہیں آئے۔ البتہ بہت دور سے ان کے قہقروں کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

مجھے یہاں سے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا اور نہ یہ معلوم ہو سکا تھا کہ ان غریب قیدیوں پر کیا گزری ہے؟ جتنیں ان بد معاشوں نے پر غمال بنا رکھا ہے۔ ان قیدیوں میں اس لانچ کے عملے کے لوگ بھی تھے۔ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا تھا اس کی بھی خبر نہیں ہو رہی تھی۔ دونوں لانچوں کے انجنوں کے چلنے کے شور کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چاروں طرف ایک گہرا سناٹا اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ جن لوگوں کو قیدی بنایا گیا تھا ان لوگوں نے بھی کوئی ہل بازی یا شور شرابہ نہیں کیا تھا۔ وہ ان لوگوں کو مسلح دیکھ کر اور شاید ان کی دھمکیوں کے خوف سے چپ ہو گئے تھے۔

اب اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا تھا کہ ان بد معاشوں کے سرخند کو میری تلاش ہے اور وہ میرے کارنامے اور فرار سے بہت زیادہ خوف زدہ بھی ہے۔ وہ میری مگر قناری کے لئے پاگل ہو رہا ہے۔ وہ ڈاکٹر قہقہہ خدا کو پھر سے انگوڑا کر کے پر غمال بنانا چاہتا تھا کہ تبدیلی انھوں کا آپریشن کرا کے تجرہ کیا جاسکے۔ اس پر تجربہ کا بھوت سوار ہو چکا تھا جس کا اتنا آسان نہیں تھا۔

ہو رہیوں کے درمیان لیے رہنے سے مجھے زیادہ سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے سخت خند آ رہی تھی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی خند کو بھگا دیا تھا کیا پتا کس وقت جزیرہ آجائے اور میں ان کی قید میں چلا جاؤں۔ میری مشکل یہ تھی کہ میں ہو رہیوں کے درمیان سے نکل نہیں سکتا تھا اس لئے کہ عرشے پر پہرہ داروں کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہاں اور اس لانچ سے نجات پانے کی کوئی تدبیر نہیں آ رہی تھی۔

اس طرح چار گھنٹے گزر گئے۔ پھر لانچ کی رفتار دہی ہو گئی جیسے ان بد معاشوں کی کوئی منزل آگئی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد لانچ رک گئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس لانچ سے قیدیوں کو اتارنا لگا۔ قیدی جب اتارنے لگے تو انہوں نے شور شرابا، بھٹ و ٹکرا اور سپرہ دار بد معاشوں سے لڑنا بھڑکانا شروع کر دیا تھا۔ بد معاش انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لڑکیاں دردی تھیں اور ان کی سسکیاں نفضا میں گونج رہی تھیں۔ کوئی پندہ میں منت کے بعد چاروں طرف مگر اس کوٹ چھایا تھا اور اس لانچ پر کسی کی موجودگی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لانچ شاید اس طرح صبح تک یہاں کھڑی رہے گی اور اس میں جو سامان لدا ہوا ہے وہ دن میں اتارنا جائے گا۔ اب مجھے

”شامو! یہ سلاسلار کہاں غائب ہو گیا؟ ہم نے آس پاس کا سارا علاقہ چھان مارا۔ دو دنوں استیرون اور لانچوں کی بھی تلاشی لی۔ وہ اور اس کے ساتھ جو لوگ تھے وہ گم ہو گئے۔ سر کے سینک کی طرح غائب ہو گئے۔“

”آج تک ہمیں اور ہمارے پاس کو ایسے ذہین اور چالاک دشمن سے واسطہ نہیں پڑا..... کیوں؟“ دوسرے نے کہا۔ ”یہ سلاسلار ہے جو نہ صرف فرار ہوا بلکہ اس نے ہمارے ایک اڈے کو پتا ہو برپا کر کے رکھ دیا۔ وہاں قید لوگوں کو بھی لے گیا اور دو آدمیوں کو قتل بھی کر دیا۔“

”اسی لئے تو ہمارے پاس کاموز آج بہت خراب ہے۔ اسے خوف پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں سلاسلار جزیرے کا پتا نہ چلائے۔“

”ہاں! نے کل سب سے کہا ہے کہ سلاسلار کو ہر قیمت پر گرفتار یا انگوڑا کر کے لایا جائے! ڈاکٹر قہقہہ خدا کو بھی..... اس لانچ میں جعفر کی لاش اور سلاسلار کے سوا کوئی اور نہ تھا میرا خیال ہے سلاسلار نے دوسرے لوگوں کو اس استیرون میں سوار کر دیا ہو گا۔“

”ہاں آج کے ہمارے اس کارنامے سے شاید بہت خوش ہو گا۔ بہت دنوں کے بعد ہم نے ٹکڑا کھا کر کیا ہے۔“

”کون سا ٹکڑا کھا کر.....؟“ اس کے لیے میں حیرت تھی۔

”یہ لانچ اور کون سا شکار.....؟“ اس کے سامنے نے کہا۔ ”جانتے ہو اس میں دال بھات کی بچاس سے زائد ہو بیاں ہیں۔ اس کے علاوہ اور بہت سا سامان بھی ہے۔ بکریے اور مرغیاں بھی ہیں، خادم نے چار مرغیاں ذبح کر دی ہیں تاکہ انہیں فرائی کیا جا سکے۔“

وہ دونوں لانچ کے سامان اپنے پاس اور میرے کارنامے کے بارے میں باتیں کرنے لگے تھے۔ مجھے ان کی موجودگی سے بڑی وحشت سی ہو رہی تھی۔ میرا پس چلتا تو ان دونوں کو اٹھا کر پانی میں چھینک دیتا یا ان کے سر پر کسی سخت چیز کی ضربیں لگا کر بے ہوش کر دیتا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے ایک آواز سنی، کوئی دوسرے انہیں پکار کے کہہ رہا تھا وہ آکر چائے پی لیں۔ وہ دونوں اس کی آواز سن کر وہاں سے اٹھ کر چلے گئے تو میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اس لئے بھی کہ مجھے چھینک آجاتی یا کھانسی اٹھ جاتی تو میں دھریا جاتا۔ ان کے پہرے نے مجھے ایک کرناک اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک طرح مجھے ذہنی اذیت سے نجات ملی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ پھر آئیں گے اور مجھے پھر اس اذیت سے

”کون ہے.....؟ ماجو! یہ کیا تم ہو.....؟ زرارہ تو آؤ۔“

ایک بد معاش دیکھ چکا تھا جس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے بغیر کسی تاخیر کے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ بد معاش پوری قوت سے پیچھے لگا۔ ”چکرو..... دوڑو..... ایک آدمی بھاگ رہا ہے..... نذر! رستم! قاسم! اور ماجو جانے نہ پائے.....“

میں پانی میں چھلانگ لگا کر سطح پر ابھرا اور دھرجہ راندی اندر تیرتا ہوا تیزی سے مخالف سمت بڑھنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد کسی نے رینگ کے پاس کھڑے ہو کر مجھ پر ایک فائر جھونک دیا۔ شاید یہ وہی بد معاش تھا جس نے مجھ دیکھ لیا تھا۔

اس بد معاش کو میں اندر میرے کی وجہ سے نظر نہیں آیا تھا اس نے اندازے سے فائر کر دیا تھا۔ پھر وہ اندر ہند فائر کرنے لگا۔ میں خوش قسمتی سے اس کے پہلے فائر سے بچ گیا تھا۔ میں خاصی دور نکل چکا تھا۔ اس کے نشانے خطا ہو رہے تھے۔ یہ اندر میرے لئے پناہ ثابت ہو رہا تھا جس اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

میری یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی اس لئے کہ سرچ لائٹ کی روشنی پڑنے لگی۔ پھر میں نے بہت سارے بد معاشوں کا شور سنا۔ دو تین مونڑوں کے انجنوں کے اشارت ہونے کی آوازیں سنیں۔ بہت سارے بد معاش میرے تعاقب میں آ رہے تھے۔ شاید ان کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ میں سالار ہوں وہ مجھے ہر قیمت پر پکڑنا چاہتے تھے۔ برے پھنسے بیٹے سالار..... میں نے دل میں اپنے آپ سے کہا۔ اب تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے یہ لوگ تمہارا قیدی بنا کر کھائیں گے۔ یوں بھی ان بد معاشوں کا سرخند آدم خوب ہے۔

پانی بے حد سرد تھا پھر بھی مرنا کیانہ کرتا۔ میں پانی کے اندر پھٹکی کی سی تیزی سے ساتھ تیرتا ہوا چلا رہا تھا۔ میں نے بھی تیر کر لیا تھا کہ یہاں سے نکل جاؤں گا۔ گو یہ ایک طرح سے ناممکن سا لگ رہا تھا پھر بھی میں نے بہت نہیں ہاری تھی اور میرے حوصلے بھی بہت بلند تھے۔ دو تین مونڑوں جو میرے تعاقب میں تھیں ان میں سے گولیاں چل رہی تھیں۔ وہ مجھے زندہ پکڑنے کے مؤذ میں معلوم نہیں ہوتے تھے۔ زندہ یا مردہ دونوں صورتوں میں ان میں میری ضرورت تھی۔ اس طرح کوئی نصف گھنٹہ گزر گیا۔

آج میری تیراکی کا حاصل امتحان تھا۔ مجھ پر بھی ایسی افتاد آن نہیں پڑی تھی۔ میں نے خطرناک جانوروں سے بڑے بڑے خوفناک جنگلوں میں مقابلہ بھی کیا تھا۔ پہلی مرتبہ

اس لالچ سے اور اس علاقے سے ہریت پر نکل جانا چاہئے ورنہ یہ بد معاش مجھے بخشیں گے نہیں۔ میں کوئی بوٹ یا کشتی لے کر یہاں سے فرار ہو سکتا ہوں۔ رات کے تین بج رہے ہیں تمام بد معاش سونے کے لئے جا چکے ہوں گے اور یوں بھی سردی میں خاصی شدت پیدا ہو چکی تھی۔ یہاں تو مجھے سردی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ اس بات کا امکان تھا کہ یہاں کشتیاں موجود ہوں گی اس لئے کہ یہ گھاٹ تھا جس نے یہ سوچتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ پوری بنانے کے لئے بڑھائے تھے کہ میں نے لالچ کی بیڑھی پر آوازیں سنیں۔ دو تین بد معاش تیزی سے اوپر آ رہے تھے۔ وہ تینوں عرش پر آکر کھڑے ہو گئے۔ میں ان کے چہرے دیکھ نہیں سکتا تھا کہ ان کے ہاتھ کرنے کی آوازیں صاف سن رہا تھا۔ ہر لفظ واضح تھا۔ ان میں ایک بد معاش جس کی آواز پناہ دار تھی اور فضا میں گونج رہی تھی وہ کہہ رہا تھا۔ ”غنی! تم آگیا کرو! یہ لالچ اسی وقت دوسرے گھاٹ کی طرف لے جاؤ۔ آٹھ دس آدمیوں کو لے لینا اور تمام بوریاں اور سارا سامان جو ہے وہ صبح سے پہلے لالچ سے اتار لینا۔ سورج نکلنے سے پہلے یہ لالچ کسی گاؤں کے کنارے کھڑی ہوئی ہوگی۔ تم یہ کام پہلے سے کرتے چلے آ رہے ہو۔ چلو شاہ!.....“

”ان قیدیوں کو کہاں بند کیا جائے؟ کیا میں انہیں بھی لالچ میں لے جا کر گودام کے ساتھ والی کوٹھری میں بند کر دوں؟“ یہ دوسری آواز تھی۔

”ان کے بارے میں کل دیکھا جائے گا..... میں نے ان سب کو بیرک میں لے جا کر بند کر دیا ہے اور پھر یہاں سے ان کے بارے میں ہدایات بھی تو حاصل کرنا ہیں۔ ہاں شاید انہیں بیرک ہی میں رکھنا پسند کرے۔“

پناہ دار آواز والا بد معاش بیڑھی اتر کے چلا گیا تو غنی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”تم بیڑھی جلدی سے ہٹا لو میں کاک پٹ میں جا رہا ہوں۔“

اب تو کھوار سر پر لٹنے لگی تھی۔ یہاں کسی چوہے کی طرح دیکے ہٹنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد لالچ نے آہستہ آہستہ ریٹینا شروع کیا تو ان بوریوں کے درمیان سے نکلنے کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے غیر محسوس انداز سے ایک بھری ہوئی بوری ہٹائی اور پھر بوریوں کے درمیان سے نکل کر عرصے پر بیٹھ گیا۔ پھر میں بلٹی کی طرح دبے پاؤں چلتا ہوا رینگ کے پاس پہنچا۔

ادھر گرا اندر میرا تھا اور کسی کے دیکھ لینے کا امکان نہیں تھا۔ میں رینگ میں گئے پانچوں کے درمیان میں سے نکل رہا تھا کہ اس بد معاش نے کاک پٹ میں سے چلا کر پوچھا۔

تک چلنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں کافی دور تک نکل آیا ہوں۔ مجھے ایک جگہ پہنچ کر رکتا ہوا اس لئے کہ اس جگہ پر جنگل کا سا گمان تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میری جیب میں پنسل ٹارچ پڑی ہے۔ میں نے اسے نکال کر دیکھا۔ وہ واٹر پروف تھی اس لئے پانی سے محفوظ رہی تھی۔ گو یہ پنسل ٹارچ تھی مگر اس کی روشنی بہت تیز تھی اور دور تک جاتی تھی میں نے صرف ایک لمبے کے لئے چاروں طرف روشنی ڈالی اس لئے کہ اس روشنی کو دشمن کے دیکھ لینے سے مجھ پر معیت نازل ہو سکتی تھی۔

میرا گمان درست نکلا تھا۔ میں ایک گتے جنگل کے پاس کھڑا تھا۔ ادھر بہت تک سناٹا اور تاریکی ایسی ہی تھی جیسے جنگلوں میں ہوتی ہے۔ ایسے جنگلوں میں دلدل بھی ہوتی تھی اور ٹالاب بھی، رات کی وجہ سے میں اپنا سفر جاری رکھ نہیں سکتا تھا اور پھر یہاں کسی درندے کا سامنا بھی ہو سکتا تھا۔ میرے پاس ریو الو تھا وہ اس لئے بیکار تھا کہ اس کی گولیاں پانی میں پھینکنے کی وجہ سے استعمال کے قابل نہیں رہی تھیں۔ البتہ میرے پاس ایک تیز دھار والا خوفناک چاقو تھا جو اس وقت میرا ساتھی اور مددگار بھی تھا۔ کسی بھی مشکل میں میرا ساتھ دے سکتا تھا۔

میں نے دوسری طرف بڑھ کر اس سمت ٹارچ کی روشنی پھینکی تو وہاں درختوں کا جھنڈ تھا۔ اس کے پیچھے ایسے لگا جیسے کوئی جھوپڑی یا مٹی ہوئی ہو۔ جنگل میں درختوں کے بیچ کسی کنیا کا بنا ہوا تجارتی انگیز اور ناقابل یقین تھا۔ میں اپنا تنگ دور کرنے کے لئے اس طرف بڑھا تو میرے بائیں ہاتھ میں ٹارچ تھی دائیں ہاتھ میں چاقو تھا یہاں کنیا تھی تو آدمی بھی ہو سکتا تھا۔ آدمی ہو سکتا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں قریب میں نہ سہی کسی قدر دور کوئی آبادی بھی ہو سکتی تھی۔ انسان کہاں کہاں اپنا سر چھپاتا پھرتا ہے اور خدا اسے وہاں بھی رزق پہنچاتا ہے۔

میں دبے پاؤں اور بڑے محتاط انداز سے اس کنیا کی طرف بڑھا۔ اس قدر احتیاط کے باوجود دیتے میرے کے پیروں تلے آکر چرے مرائے۔ پھر میں رک رک کر بڑھا اور دروازے پر پہنچ گیا اس کا دروازہ مضبوط چٹائی کا تھا اور بند تھا۔ باہر اس کی کٹڑی میں ایک چھوٹا سا کالا لگا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس میں کوئی رہتا ہے اور وہ اس وقت یہاں نہیں ہے کہیں گیا ہوا ہے۔ اس وقت کیا معنی تک اس کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

میں نے پہلے ڈھٹا لے کر کچرے کے زور سے بلایا وہ نہیں کھلا تو اسے بڑے زور سے ایک جھٹکا دیا۔ پھر وہ کھل گیا۔ میں نے کالا نکال کر زمین بے پروائی سے پھینک دیا اور کنیا کے

مجھے آزمائش سے گزرنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ میں نے جو تک جگہ دیش میں پرورش پائی تھی اور یہیں پلا بڑھا تھا میرے گھروالے برصغیر کی تقسیم کے بعد ہجرت کر کے یہاں آئے تو یہ اس وقت مشرقی پاکستان تھا۔ جہاں میں نے بہت ساری چیزیں سیکھیں تھیں ابھی سیکھ لیا۔ ندی نالوں اور دریاؤں نے میرے اس شوق کو مزید ہوا دی۔ میں جب دس برس کا تھا تب سے تیراکی کے بڑے بڑے مقابلوں میں حصہ لینے لگا تھا۔ میں نے تیراکی کے کئی مقابلوں میں اول انعامات بھی لئے تھے۔ میں نے اس شوق کو اس لئے بھی ترک نہیں کیا تھا کہ اس سے مجھے بڑی شہرت ملی تھی اور میں نے بعد میں بھی اسے جاری رکھا تھا بلکہ ایک ماہر تیراک سے تربیت بھی حاصل کی تھی۔ تیراکی صحت کے لئے بہت اچھی ورزش تھی۔ شکار کے بعد مجھے تیراکی سب سے زیادہ پسند تھی۔ آج تیراکی کا شوق تجربہ اور مہارت میرے کام آگئی تھی۔ میں نے تھاقب کی وجہ سے اپنا رخ تبدیل کر لیا تھا۔ اس لئے دشمن میرے تعاقب میں کسی اور سمت نکل گیا تھا۔

میں نے جہاں جہاں اندھیرا دیکھا اور سرچ لائٹ کی روشنی نہیں پڑی تھی وہاں وہاں پانی کی سطح پر ابھر کے دشمن کے آدمیوں کو دیکھ لیتا تھا۔ بہت دور نکل آنے کے بعد جیب میں نے انہیں کسی اور سمت جاتے دیکھا تو میں کنارے کی طرف بڑھنے لگا پھر میں ایک کنارے پر پہنچ گیا۔ یہ دریا تھا جس میں میں تیرتا رہا تھا۔ گھپ اندھیرے کی وجہ سے میں کچھ اندازہ نہ کر سکا کہ یہ گاؤں سے یا جزیرہ منارے پر یا کوئی نام روشن بھی نہیں تھا جس سے میں کچھ اندازہ کر سکتا۔ بہت سارے اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا میں زمین پر بیٹھ کر سستانے لگا۔ ٹھنڈے پانی میں اور بہت دیر تک تیرتے رہنے کی وجہ سے میرے ہاتھ پیر شل سے ہو رہے تھے اور جسم بھی بہت تھکن محسوس کر رہا تھا شاید اس لئے کہ اب پہلے کی طرح میں دیر تک تیر نہیں سکتا تھا اور اب میں زیادہ دیر تک تیرتا بھی نہیں تھا۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں اور پانی میں بھی پوری طرح شرابو رہو ہا تھا پھر بھی زمین پر لپٹ گیا۔ لینے سے اور زیادہ سردی محسوس تو ہو رہی تھی مگر اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔

پھر میں زیادہ دیر تک لینا نہیں رہ سکا اٹھ بیٹھا۔ میں نے سوچا کہ یہاں لینے رہنے سے تو بہتر ہے کہ چلتے رہتا چاہئے۔ اس کنارے پر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ دشمن کے آدمی میری تلاش میں ادھر بھی آسکتے ہیں۔ یہ علاقہ جزیرے کے آس پاس کا تھا یہاں پر چھپے رہنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

میں نے سردی کی شدت کو کم کرنے کے لئے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر

اس کینا کے ایک کوئے میں مٹی کے جل کا چولہا اور ایک کنستر بھی رکھا تھا۔ چائے بنانے کی ایک کیتلی بھی تھی۔ ایک چھوٹے سے کارٹن میں چائے کی پتی 'ایک کپ' شکر اور خشک دودھ کا ایک دو باغی تھا ایک تھموس بھی تھا جس میں پانی تھا گویا یہاں کوئی رہتا بھی تھا۔ میں نے بغیر کسی تکلف کے چائے پانی۔ چائے سارے پانی کی بنالی تھی۔ میں نے دو کپ چائے پانی تو بدن میں حرارت 'تازگی اور توانائی لوٹ آئی تھی۔

چائے پینے کے بعد میں چوکی پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ یہ کینا یہاں کس لئے بنائی گئی ہوگی اور یہاں کون رہتا ہو گا۔ جو رہتا ہو گا وہ کس مقصد کے لئے رہتا ہو گا۔ کیا معلوم یہاں کسی بد معاش نے اپنی رہائش بنالی ہو۔ یہ بد معاش کوئی بھی مفروز ملزم ہو سکتا ہے جو پولیس کو مطلوب ہو۔ وہ شکار یوں کو شکار کرتا ہو۔ اس نے کسی شکاری کو یہاں لاکر قتل کیا ہو گا اور اس کی لاش ٹھکانے لگنے لے گیا ہو گا رات زیادہ ہونے کی وجہ سے نہیں آیا ہے۔

سوچتے سوچتے میں گہری نیند سو گئی۔ نیند کے غلبے اور تھکن نے مجھے جاگنے نہیں دیا۔ میں شاید ہی ایسی گہری نیند کبھی سویا تھا۔ جب میں بیدار ہوا تو صبح ہو چکی تھی۔ نیند کی وجہ سے میں اپنے سارے بدن میں ایک تروتازگی سی محسوس کر رہا تھا۔ مجھے بھوک لگنے لگی تو میں نے چائے بنا کر پی۔ پھر کینا سے باہر آیا۔ میں کینا سے باہر آیا تو سردی تھی۔ اندھیرا بھی تھا۔ میں درختوں کے جھنڈے سے باہر نکلا تو مشرقی افق پر سورج چمک رہا تھا۔ آس پاس جو اونچے اونچے درخت تھے ان کی شاخیں سرد ہوا کے جھوکوں سے جھوم رہی سی تھیں۔ ہمیں طرف اونچی نیچی پھاڑوں کا سلسلہ تھا جو درخت چلا گیا تھا۔ اس جگہ پر رنگائی کے جنگل کا دھوکا ہو رہا تھا۔ ان پھاڑوں پر سبزہ اگا ہوا تھا جو درختوں سے دلفریب نظر آ رہا تھا۔ میں نے کنارے پر دو موٹر بوٹس کھڑی دیکھیں تو میں گھبرا کے اٹنے قدم درختوں کے جھنڈ میں چلا آیا۔ کوئی بد معاش وہاں نظر تو نہیں آیا لیکن میں نے خطرے کی بو سونگ لی تھی۔ بد معاش ادھر میری تلاش میں اٹکے تھے اور شکاری کتوں کی طرح میری بو سونگتے پھر رہے تھے۔ اب تو اس کینا میں روپوش ہونا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ دوسری طرف یہ جنگل تھا جو اس قدر خوفناک گھنا اور تاریک دکھائی دے رہا تھا کہ اس کے اندر راست بنانا مجھے آسان نہیں لگ رہا تھا مگر مجبور تھی کہ مجھے اس کے اندر ہی سے گزرنا تھا۔ اگر مجھے کنارے پر بوٹس نظر نہ آتیں تو میں ساحل کے ساتھ ساتھ ایک سفر جاری رکھتا۔ صبح کے وقت دریا بھی پُر سکون ہوا تو اور اس کے پانی کے ہماؤ میں سبک خراہی ہوئی ہے جو سورج کے نمازت میں آنے کے بعد دم توڑ دیتی ہے۔ میں دریا میں تیرتا ہوا کسی بھی قریبی گاؤں

اندراغل ہو کر تاراج کی روشنی میں اسے دیکھا۔ یہ درمیانہ سائز کے ایک کمرے جتنی تھی۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں معا میری نظریوں کی پڑی جو دیوار سے لگی تھی۔ اس پر کپڑے اور کچھ چیزیں بکھری تھیں اور اس کے سین اوپر ایک طاق تھا اس میں ایک بڑی سی لائین اور ماچس رکھی تھیں۔ میں نے چوکی پر چڑھ کر ماچس اٹھائی اور لائین نیچے اتار کر چوکی پر رکھ دی۔ ماچس میں دیاسلٹیاں تھیں۔ میں نے لائین جلائی اور اس کی بقی کی بو بھائی تو کمرہ روشنی میں نہ آیا۔

مجھے شدید سردی رہی تھی اس لئے جینی کے اوپر ہاتھ رکھ کر اس کی نو سے ہاتھ تاپنے لگا۔ ہاتھ تاپتے تاپتے میں نے کپڑوں کی طرف دیکھا تو ایک دم اچھل پڑا۔ ایک سرد لبر میری بدنہ کی ہڈی میں جمید کرتی ہوئی اتر گئی۔ کپڑے خون آلود پڑے تھے اور ان میں جو خون لگا ہوا تھا وہ تازہ لگ رہا تھا یہ کپڑے کسی شکاری کے معلوم ہوتے تھے۔ میں نے کپڑے اٹھا کر دیکھے تو اس کے نیچے ایک پتول تھا۔ اس پتول کو اٹھا کر دیکھا تو اس میں چار گولیاں تھیں میں نے فرش پر دیکھا تو اس پر جا پھونچا پڑا تھا اور دروازے تک چلا گیا تھا اب لگ رہا تھا جیسے یہ قتل کی واردات ہے۔ کسی بد معاش نے ایک شکاری کو قتل کرنے کے بعد اس کے خون آلود کپڑے اتار دیئے اور اسے جیسے چادر میں لپیٹ کر لے گیا ہو۔

میں نے کپڑوں کی تلاشی کی تو اس میں ایک شکاری چاقو ایک پرس اور رومال برآمد ہوا۔ پرس میں دو ہزار ٹاکا چھوٹے اور بڑے نوٹوں کی شکل میں تھے۔ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اس مقتول شکاری کی شناخت ہو سکتی۔ کمرے میں ایک طرف شکاری کے جوئے اور موزے بھی پڑے تھے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا معرہ ہے۔

میں نے جو تہ دیکھے تو اتفاق سے وہ میرے ناپ کے تھے میں نے اپنے جوتے اور موزے نکال کر وہ جوتے اور موزے چڑھائے اس لئے کہ جوتے پانی میں بار بار جھینکے اور بڑی دیر تک بیٹھے رہنے سے نرم ہو رہے تھے پھر میں نے اس کا پرس اور پتول بھی جیب میں رکھ لیا۔ خون آلود کپڑے نکال کر ایک طرف ڈال رہا تھا تو میری نظریں چوکی کے سرانے پر پڑی۔ ایک میلی سی چادر کے نیچے سے ایک دستہ بیک جھانک رہا تھا۔ میں نے اس بیک کو کھول کر دیکھا تو اس میں ایک صاف ستھرا جوڑا تھا۔ یہ بھی ایک عجیب سا اتفاق تھا کہ یہ لباس بھی میرے سائز کا تھا جیسے اس میں میرے لئے رکھا گیا ہو۔ میں نے اپنا گیلہ لباس نکال کر اسے پہننے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کی۔ کپڑے بدلنے سے میری سردی کم ہو گئی تھی۔



میں پہنچ جاتا اور اس طرح مجھے دشمن کی دسترس سے نکل جانے میں آسانی ہو جاتی اور دشمن کو ناکامی کا سہہ دیکھنا پڑتا۔

پنسل مارچ کی روشنی کی مدد سے میں تیزی کے ساتھ درختوں کے درمیان سے ہوتا ہوا ایک سمت چل پڑا۔ ایسے تاریک اور گھبرے جنگل سے گزرنے کا یہ پہلا اتفاق نہیں تھا۔ ملایا کے جنگل اس سے کہیں گہرے اور تاریک تھے۔ وہ اس لئے بہت زیادہ پُر خطر ہوتے تھے کہ دلدلی بھی ہوتے تھے۔ مجھے ملایا کے جنگل یاد آگئے تھے۔ اس جنگل میں بھی دلدل کا گمان ہو رہا تھا۔ جنگل میں دلدل ضرور ہوتی ہے اس لئے میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد مجھے ایک سمت درختوں کی اوٹ میں سے سورج کی روشنی نظر آئی۔ یہ ایک تیز اور روشن لکیر تھی۔ میں نے اپنا رخ اس طرف کر لیا جب میں نے خاصا فاصلہ طے کر لیا تب مجھے ایک جگہ رکنا پڑا۔ وہاں پُر زمین جو تھی وہ دلدلی تھی۔ میں گھوم کر جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بہت دور سے ایک تیز اور سنسنائی ہوئی آواز سنائی دی۔ میرے کان دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔ یہ گولی چلنے کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک جانور کی آواز بھی سنائی دی جو معلوم نہیں کس جانور کی تھی۔ پھر گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ گولی چلنے اور جانور کے غرغرائے کی آواز سے ایسا لگ رہا تھا کہ آدمی اور جانور کے درمیان مقابلہ ہو رہا ہے۔

چند لمحوں کے بعد پھر سانپا سا چھا گیا۔ میں دلدلی جگہ کے کنارے سے ہوتا ہوا پھر چل پڑا۔ میں نے اپنی جب سے پتول نکال لیا اس لئے کہ کسی بھی خطرناک جانور سے واسطہ پڑ سکتا تھا۔ ابھی جو گولی چلی اور جانور کی آواز سنئی اس سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں خطرناک جانور موجود ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنے آپ کو ایک کٹلے میدان میں پایا۔ آس پاس جھاڑیوں کا بھی سلسلہ تھا۔ بائیں طرف پہاڑیں نظر آ رہی تھیں۔ دیا کی لہریں ان سے ٹکرا رہی تھیں نضا میں ان کا شور گونج رہا تھا۔ اس جنگل کا ایک سرا ان پہاڑیوں کے پاس جا کر ختم ہوا تھا۔

میں جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ چند قدم چلا تھا کہ مجھے ٹھٹک کے رکنا پڑا۔ زمین پر خون کے دبے تھے۔ یہ دبے جابجا نظر آ رہے تھے۔ اس جگہ کسی لڑائی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا کہ کسی بڑے جانور نے جو شدید زخمی حالت میں تھا جھاڑیوں کو بری طرح روندنے کی کوشش کی ہے کیونکہ زمین پر اس کے ہونے چھوٹے چھوٹے جنگلی پودے اور گھاس روندی ہوئی سی تھی اور جگہ جگہ خون ہی خون بن کر ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں خون

کے دھبے دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ معامیری نظریا ایک پھوٹی سی پچیلی چیز پر پڑی۔ میں نے بنگ کر اسے اٹھایا وہ ایک خالی کارٹوس تھا۔

اب میرے لئے یہ بات صاف اور واضح ہو گئی تھی کہ یہاں کسی آدمی اور خوفناک جانور کے درمیان مقابلہ ہوا ہے۔ یہ آدمی شکاری نہیں تھا۔ شکاری ہوتا تو وہ ہندو سے فائر کرتا۔ بہت کم شکاری ریوالتا پتول استعمال کرتے تھے۔ میں نے پتول چلنے کی آواز سنی تھی یہ کارٹوس بھی پتول کی گولی کا تھا۔ یہ آدمی اگر شکاری نہیں تھا تو اس کی ذہانت کی داد دینا پڑتی تھی کہ اس نے ایک پتول سے ایک بڑے جانور پر قابو پایا۔ ان دونوں کے درمیان مقابلے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آثار سے ایسا لگ رہا تھا کہ جانور زخمی ہو کر بھاگ گیا ہے۔

مجھے دوسری طرف شکاری بوٹوں کے نشان نظر آئے۔ گویا یہ شخص شکاری ہی تھا۔ میں ان نشانات کو دیکھتا ہوا زمین کا معائنہ کر رہا تھا کہ چانک کر اپنے کی آواز سنائی دی۔ یہ جانور کی نہیں کسی انسان کے کر اپنے کی آواز تھی۔ سامنے والی جھاڑیوں میں سے سنائی دے رہی تھی۔ میں اس طرف تیزی سے بڑھا۔ جھاڑیوں کے پار ایک مکلی جگہ تھی جو جھاڑیوں سے گھری تھی۔ ان جھاڑیوں کے قریب ایک شخص زمین پر پڑا اور دروازیت سے تڑپتا ہوا کر رہا تھا میں لپک کر اس کے قریب پہنچا۔

اس آدمی کو دیکھ کر میں بری طرح چونک پڑا۔ یہ سمجاش دہ تھا۔ ایک مشہور اور تجربہ کار شکاری۔ اسے یہاں دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی اور اس حالت میں دیکھ کر کہہ بھی ..... وہ شدید زخمی حالت میں تھا۔ اس کے ہاتھ کی آستین پھٹی ہوئی تھی اور ہاڑوں میں زخم اور خراشیں تھیں۔ ان میں سے خون بہہ کر اس کی آستین کو گیلیا چکا تھا۔ اس کے چہرے پر بہت سارے زخم تھے۔

اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ وہ آخری سانس لے رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اسے بڑی آہستگی سے پکارا۔

”سمجاش دہ!“ ..... اس نے میرے آواز دینے سے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی آنکھیں نہیں کھولیں تو میں نے اس کا شانہ بہت آہستگی سے ہلایا۔ ”سمجاش دہ!“ آنکھیں کھولو..... ادھر دیکھو۔“

سمجاش دہ نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی دیران اور پتھرائی آنکھوں میں سے وہشت جھانک رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی



ذہلک گئی۔ وہ اس دنیا سے چل دیا۔

اس کی موت بھی مشتاق چوہدری کی طرح افسوسناک حالت میں ہوئی تھی۔ مشتاق چوہدری شدید زخمی حالت میں کسی نے کسی طرح اپنے گھر پہنچ گئے تھے وہ بڑے سخت جان تھے جو اس زخمی حالت میں دو ایک دن زندہ رہ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر میں دم توڑا تھا۔ سبھاں دتہ کی موت ایسی تلک پر واقع ہوئی جہاں سے اسے آخری منزل پر پہنچانے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے اس کی کھلی آنکھوں کو بند کر دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

سبھاں کی الم ناک موت جس حالت میں جس طرح سے ہوئی تھی اس نے میرے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ میری آنکھیں آپ آپ پر نم ہو گئیں۔ میری جگہ کوئی اور بھی فحش ہوتا اس آدمی کو دردناک انداز میں مرتے دیکھنا تو اس کے دل میں بھی دکھ ہوتا۔ سبھاں دتہ میرے شکاری دوستوں میں سے تھا اس کی موت سے میرے دل کو جو صدمہ پہنچا تھا وہ فطری امر تھا۔

سبھاں دتہ کی اس دردناک موت میں اس درندہ صفت فحش کا ہاتھ تھا جو انسانوں کا شکاری تھا۔ سبھاں دتہ کو موت نے تھوڑی سی سہلت اور دی ہوئی تو میں اس سے اس درندہ صفت فحش کے بارے میں معلوم کر لیتا۔ مجھے صرف اس کا نام معلوم ہو سکا تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ کیا ایک ڈاکٹر ایسا شقی القاب بھی ہو سکتا ہے؟

سبھاں دتہ کی دردناک موت جن حالات میں واقع ہوئی تھی اس نے مجھے ایک خطرے سے آگاہ کیا کہ میں بھی اس درندہ صفت فحش کے حصار میں ہوں اور وہ میرا بھی شکار کر سکتا ہے۔ اور میں اس کے زیرے میں پھنسا پھر رہا ہوں۔

میں سبھاں کی موت کی آخری رسومات ادا کرنا چاہتا تھا جو اب میرے لئے ناممکن تھا اس لئے کہ وہ درندہ صفت انسان کسی بھی لمحے اپنے شکاری تلاش میں آ سکتا ہے اور اسے یہاں سے اٹھا کر لے جاسکتا ہے۔ وہ اپنے کتے کو زخمی حالت میں پا کر ضرور آئے گا۔ اب مجھے اپنا بچاؤ کرنا چاہئے۔ میں تیزی سے سوچنے لگا۔ ورنہ میں اس کے چنگل سے بچ نہ سکوں گا۔ یوں بھی اسے میری تلاش ہے۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے کچھ آوازیں سنیں جو تین چار آدمیوں کی تھیں۔ وہ اس طرف بڑی تیزی سے آ رہے تھے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سبھاں دتہ کا پتوٹل اس کے پاس ہی پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا پھر میں دوسری طرف بھاڑیوں میں پگ کیا۔ میں ان بھاڑیوں کے پاس پہنچا تھا کہ میری پشت پر ایک تیز دند آواز گونجی۔ ”دک جاؤ“

چنگ اور حیرت سی چھا گئی۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا۔ ”مسٹر سالار! آپ اور یہاں.....؟“

”ہاں میں.....“ میں اس کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ ”آپ یہاں کیسے.....؟ کیا آپ یہاں شکار کے لئے آئے تھے؟“

”نہیں.....“ اس نے اپنے سر کو جیش دی۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار پیدا ہوئے۔ ”مجھے یہاں..... ڈاکٹر اوہس نے اغوا کر لیا ہے۔ اس نے مجھے یہ غلام بنا کر رکھا تھا۔“

”ڈاکٹر اوہس.....؟ یہ کون ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کا نام سنا تھا۔

”ڈاکٹر اوہس..... درندہ صفت آدمی ہے بلکہ اسے آدم خور کہنا چاہئے۔“ سبھاں دتہ کو باتیں کرتے ہوئے بڑی اذیت و تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ رک رک کر بول رہا تھا۔ اس کی سانسیں بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ”وہ انسانوں کا گوشت کھاتا ہے۔“

”کیا آپ یہاں سے فرار ہو رہے تھے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں بھانکا۔ ”آپ کی یہ حالت کیسے ہوئی؟ کیا کسی درندے نے حملہ کیا تھا آپ پر؟“

”نہیں.....“ اس نے مجھے اپنی پچھلی پچھلی دہشت سے بھری آنکھوں سے دیکھا۔ ”وہ غیبت اس جنگل میں میرا شکار کھیل رہا ہے اس کے ساتھ کتے بھی ہیں۔ اس کے ایک کتے نے میری یہ حالت کر دی ہے۔ وہ میرے پتوٹل سے زخمی ہو کر بھاگ گیا۔“ میں نے چو کنہا ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسے سارا دے کر کھانے کے لئے بھگا۔ ”ذرا ہمت کر کے اٹھ بیٹھو سبھاں دتہ میں آپ کو یہاں سے لے جاؤں گا۔“

”سالار!.....“ وہ تھابت سے بولا۔ ”میں مر رہا ہوں۔ بس چند لمحوں کا سامان ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں اور آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں۔ آپ کی جان بھی خطرے میں.....“

اس کی سانسیں اکڑنے لگیں میں نے اس کی نبض دیکھی وہ ڈوب رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بدبوارہ تھے میں اپنا کان اس کے منہ کے پاس لے گیا وہ کہہ رہا تھا۔ ”سالار!..... سالار.....“ آپ..... بھاگ جائیں۔ وہ شیطان آنے والا.....“ اس کے ہونٹوں نے بدبواہی ابھار دی۔ دوسرے لمحے اس کی گردن ایک طرف

نہیں تو ہم جنہیں گولی مار دیں گے۔"

میں ایک دم سے ٹھک کر رک گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا مجھ سے کوئی میں بائیں فٹ کے فاصلے پر تین بد معاش کھڑے تھے۔ ان کے چہروں سے خیانت نکل رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں درندگی تھی۔ چروں پر سفاکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ مجھے جرت سے دیکھ رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں ایک چھرا تیرا ہنزلے ہوئے تھا۔ جبکہ تیسرے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے۔ دائیں ہاتھ میں وہ پستول جو نکلیا میں ملا تھا۔ دوسرا پستول بے معاش دتہ کا تھا۔

"پستول پھینک دو....." پستول والے نے تمھارے لیے میں کہا۔

"تم کون ہوتے ہو مجھے حکم دینے والے....." میں نے سخت لہجے میں اسے جواب دیا۔

"میں کون ہوں تمہیں جلد ہی پتا چل جائے گا۔" وہ کہنے کی طرح غرایا۔

"تمہارے چہرے ہی سے پتا چل رہا ہے کہ تم کون ہو۔ تم ایک نمبر کے بد معاش لگ رہے ہو۔"

میرے اس جملے پر وہ مشتعل ہو گیا۔ میں ہاتھ بائیں ہی تھا کہ وہ آپے سے باہر ہو جائے۔ اس نے پستول سے میرا نشانہ لینے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے پستول نہیں پھینکا تو ہم تمہاری ٹکا بوٹی کر دیں گے۔ میں کہتا ہوں پھینک دو پستول....." وہ بری طرح دھاڑا تو اس کا تم کا نام کاٹنے لگا۔

میں نے آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ والا پستول اس کی طرف پھینکا۔ وہ پستول ٹھیک اس کے منہ پر گیا تو اس نے پستول پکڑنے کی کوشش کی۔ میرے لئے یہ سنہرا موقع تھا اور میری چال کا سیاق ثابت ہوئی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ میرے پستول کی گولی اس کے دائیں بازو میں جوت ہو گئی اور اس کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور اس کا پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ ایک قلابازی کھا گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے نہیں دیا دوسرا فائر بھی جھونک دیا۔ گولی اس کے بائیں کندھے میں اتر گئی اور وہ الٹ کر زمین پر گر پڑا اور درد و آذیت سے لوٹنے لگا۔ اب وہ پستول چلانے یا اٹھانے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

اس کے دونوں ساتھیوں نے اس کا یہ مشر جو دیکھا تو وہ بدحواس سے ہو گئے۔ جس کے ہاتھ میں ہنر تھا وہ چہرے والے بد معاش سے ٹکرا کے زمین پر گر پڑا۔ میں نے ان

دونوں پر پے در پے دو فائر کر دیئے۔ دونوں گولیاں چہرے والے بد معاش کے گلے سے لگیں۔ ایک گولی تو اس کی دائیں ٹانگ پر دوسری اس کے کولے پر لگی..... وہ چیخ مار کر زمین پر لوٹنے لگا اور گالیاں بٹکنے لگا۔ میں نے ہنر والے پر فائر کیا جو سرعت سے کھڑا ہو گیا تھا۔ فضا میں ٹھک کی آواز گونج کر رہ گئی۔ اس وقت میں یہ بھول گیا تھا کہ پستول میں صرف چار گولیاں ہیں۔ بھر میں نے غلطی پستول ہنر والے بد معاش پر پہنچ مارا۔ وہ ایک طرف ہو گیا تو پستول اس کے پاس سے گزرتا ہوا اچھاڑیوں میں جا گیا۔

میں زخمی بد معاش کی طرف بھکی کی سی تیزی سے لپکا تاکہ اس کا پستول اٹھا لوں۔ ہنر والے بد معاش نے مجھے ہتھاپا تو وہ شیر ہو گیا اور تیزی سے میرے راستے میں حائل ہو گیا۔ میں ایک دم سے رک گیا۔ وہ اپنا ہنر کھول کر فضا میں لہرا ڈاڑ زمین پر مارتا ہوا میری طرف بڑھا تو اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے مشر نے اس کے دماغ کو کھولا دیا تھا۔ اس کے بشرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میری چھڑی اڑھیر کر رکھ دے گا اور خون پانی جائے گا۔ میرے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ اپنی جیب سے چاقو نکال سکوں۔ جیب کا شن کھولنے میں دیر ہو گئی تھی۔ "وہ میرے سر پر پہنچ چکا تھا۔ پستول والا بد معاش جو درد سے تڑپ رہا تھا وہ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "اس سڑ کو چھوڑنا نہیں....."

"تم نے مت بڑا کیا میرے دونوں ساتھیوں کو زخمی کر کے....." وہ فحشے اور حقائق سے بولا۔ "میں تمہارا بھی دی مشر کروں گا جو اس کا ہوا ہے۔" اس نے بے معاش دتہ کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ "تم مجھے نہیں جانتے ہو میں کون ہوں۔"

میں نے اسے باتوں میں لگا کر جب سے چاقو نکالنے کی مہلت کے لئے اس سے کہا۔ "واقعی میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو؟ ویسے تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے کہ تم فرید پور کے قصائی ہو کیوں؟ قصائی ہونا.....؟"

"میں قصائی نہیں موت ہوں۔" وہ بھنکارا۔ "مجھ سے فرید پور کے تمام بد معاش کا پتہ ہے۔ میرے نام سے پولیس بھی خوف کھاتی ہے۔ جو میرے مقابلہ پر آیا وہ میرے ہاتھ سے زندہ نہیں بچا..... ابھی تمہیں پتا چل جائے گا میں کیا چیز ہوں....." فوراً تم بتاؤ تم کیا چیز ہو۔

"میرا نام سالار ہے۔"

"تم سالار ہو.....؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر اس کی

میں درد سنا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

پہلے جب میں کسی چیز کی ضرب سے بے ہوش ہوا تھا اور ہوش میں آیا تھا ہسپتال کے ایک کمرے میں اپنے آپ کو پویا تھا۔ دوبارہ پتھر گلتے سے بے ہوش ہونے کے بعد ہوش آیا تو ایک سے حد خوبصورت کمرے میں تھا۔ ظاہر ہے کہ میری عمر کسی عالی شان گھر کا ہی ہو سکتا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ میں دشمن کی قید میں نہیں کسی انسان دوست یا کسی شہساز کے ہاں تھا۔ میں اگر یہاں پہنچا تھا تو دو ایک دن بے ہوش رہا تھا۔ اس لئے کہ جزیرے میں اپنے گھر کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ہسٹری سے اتر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر ہینڈل کالٹو کھایا اور دروازہ کھولا تو کھل گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں اچھل پڑا۔ دروازے پر ایک دیوہیل شکاری کتابٹھا تھا جو دروازہ کھلنے کی آہٹ پر چونک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی لمبی چمک دار زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر غرایا تو میں نے جھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔ اس کی لال آنکھیں بڑی خوفناک تھیں۔

میرے کمرے کے باہر خوفناک کتا پھر دے رہا تھا اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ میں دشمن کی قید میں ہوں مگر مجھے اس کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں دشمن کا اسیر ہوں۔ اس لئے کہ مجھے دشمن سے ایسے سلوک کی توقع نہیں تھی۔ میں نے اپنے دشمن کو بہت پریشان کیا تھا۔ میری وجہ سے اس کے دو بہترین ساتھی بندو اور جعفر اس دینا سے نیست و نابود ہو گئے تھے۔ میں نے قیدیوں کو اس کے جیل خانے سے رہائی دلائی تھی۔ اس کے ایک تجربے کا خواب پورا ہوا تو میں نہیں دیا تھا اور پھر اس کے تین آدمیوں کو شدید طور پر زخمی کر دیا تھا۔ میں دشمن کا ممان نہیں بن سکتا تھا۔

میرے دماغ میں ایک کشمکش سی جاری تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک بہت ہی حسین، پرکشش عورت کا سراپا ابھرا۔ دودھیا رنگت کی سفید ساڑھی میں لبوس تھی۔ اس کی رنگت صاف و شفاف زیتونی سی تھی۔ اس نے ایک خوبصورت ٹرے اپنے خوبصورت اور سنڈل ہاتھوں میں اٹھا رکھی تھی۔ دروازہ کھلنے پر میں نے باہر دیکھا تو وہ کتابٹھا موجود تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہو کر ایک ہاتھ سے دروازہ بند کیا پھر میری طرف مسکراتی ہوئی بڑھی۔ اس کی مسکراہٹ بھی اس کی طرح پرکشش تھی۔ وہ جسم کی پٹیاں مجھ پر ٹھنڈا کر رہی ہوئی بولی۔ ”خوش آمدید مسز سارا“ اس کی آواز میں لہجہ لگی تھی۔

اس نے پتائی پر چائے کی ٹرے رکھ دی۔ اس میں بھٹ بھی تھے جو ایک پشتری میں رکھے تھے۔ یہ پتائی پلنگ اور صوفوں کے درمیان تھی۔ وہ سیدھی ہوئی تو اس کا سراپا پیری

آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ ”وہی ہو جس نے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ تمہاری گرفتاری پر پاس نے ایک لاکھ ٹاکا کا انعام رکھا ہے۔ آج تو میری قسمت جاگ اٹھی ہے۔“ ”ہاں میں وہی سالار ہوں اور تمہارے لئے موت ہوں۔ تمہیں ایک لاکھ ٹاکا تو کیا.....“

اس نے مجھے اچانک پورا کرنے کا موقع نہیں دیا اور ہنر بھڑا دیا۔ میں تیزی سے ایک طرف ہٹ تو گیا پھر بھی اس کی دم میرے شانے پر لگی۔ وہ پھر مجھ پر ہنر بھڑا سارے کے لئے بڑھا اور ہنر فضا میں لہراتا ہوا آیا۔ میں اس مرتبہ پوری طرح چونکا اور اس کے منہ کا ہاتھر تھا۔ جیسے ہی اس ذیل سے مجھ پر ہنر بھڑا سارے کی بڑی پھرتی اور چمک دستی سے ہنر پکڑ لیا اور دونوں ہاتھوں سے ایسا زبردست جھٹکا دیا کہ وہ آگے جھک گیا۔ دوسرے لمحے میں نے ایک گھونرہ اس کی پٹلی میں دے مارا۔ اس سے پہلے کہ وہ شعلہ میں نے ایک زوردار گھونرہ اس کے منہ پر جڑیا۔ پھر وہ کئی چنگ کی طرح زمین پر گر کر خاک چاٹنے لگا۔ پھر میں نے اس کے جسم پر ہنر بھڑا شروع کر دیے۔ فضا میں اس کی دل خراش چیخ بلند ہونے لگیں۔ وہ پوری قوت سے چلتا رہا اس کی جھڑوں سے فضا گونج رہی تھی۔ معلوم نہیں کیوں مجھ پر اس وقت ایک خون سا سوار ہو گیا تھا۔ میں اسے بڑی سے رحمی سے پٹنے جا رہا تھا جیسے اسے جان سے مار دینا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں کہاں سے ایک پتھر آیا اور میری کپٹی پر تر سے آکر لگا۔ ایک دم سے میرا سر پکڑ لیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر مجھے اپنی کچھ خبر نہیں رہی میں تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆-----☆

میں بیدار ہوا تو میں نے اپنے آپ کو ایک بے حد آرام دہ اور نرم و گداز بست پر پایا۔ میں جس پلنگ پر لیٹا تھا وہ بے حد شاندار تھا۔ یہ کمرہ کسی شاہی محل کی خواب گاہ کی طرح آراستہ و پیراستہ تھا۔ فرش پر پیش قیثت قالین بچھا تھا۔ ایک کھڑکی کی منتش الماری تھی۔ ایک سنگھار میز تھی۔ بید کا صوفہ سیٹ بھی تاجس میں کشن تھے۔ ایک ٹرائی جس میں رکتیں لمبی و ڈن آوی سی آدرو پٹے پو کیٹ بھی تھے۔

میں نے اس کمرے کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ میرے ذہن میں وہ واقعات تازہ ہونے لگے جو میرے ساتھ پیش آئے تھے اور مجھے یاد آگیا تھا کہ میں کس طرح سے بے ہوش ہوا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ میں کیسں کوئی سنا خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ بھیرا تو کپٹی کے قریب ایک گومڑ نکلا۔ اس



”فرق کیوں نہیں پڑا؟“ ڈاکٹر اویس!.....“

میں اپنی بات پوری نہیں کر سکا اس لئے کہ سامنے والے کمرے کی دہلیز پر لہرا ہوا پردہ ہٹا اور میں نے ایک حسین اور طرح دار عورت کا چہرہ اور سراپا دیکھا جس نے اس عورت کو پہچان لیا یوں بھی مرد حسین چروں کو ایک بار دیکھ لینے کے بعد عرصے تک نہیں بھولتے ہیں۔ جبکہ اس عورت کے ساتھ میری بہت ساری گھڑیاں گزری تھیں۔ اسی عورت کی وجہ سے تو میں یہاں تک پہنچا تھا۔

یہ بتکم جمال تھی، وہ مسکرتی ہوئی ہماری طرف آئی تو ڈاکٹر اویس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے انہیں پہچان لیا ہو گا؟ یہ میری دوست ہیں۔“

”بہت اچھی طرح.....“ میں نے بتکم جمال کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔ ”یہ بھی ایک حسین شکاری ہیں انہیں بھی شکار کرنا خوب آتا ہے۔“

”کھانے کی میز پر چلے دو نہ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ بتکم جمال نے میز کی طرف اشارہ کیا۔

لبی چوڑی میز پر ٹکلف چائینز کھانا چٹا ہوا تھا۔ بتکم جمال نے درمیانی جگہ سنبھالی، میں اور ڈاکٹر اویس ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ بتکم جمال نے میری طرف چکن کارن سوپ کا پالہ بڑھایا۔ ”میرے خیال میں آپ کو چائیز ڈشیں پسند ہوں گی؟“

”جی ہاں.....“ مجھے ان کی ڈشیں بہت مرغوب ہیں۔“

”میں نے آپ کی تاہہ ترین کتاب کا ٹکڑا ایلے یٹن کل رات ہی پڑھا ہے۔ آپ بہت خوب لکھتے ہیں اور شکار بھی خوب کرتے ہیں۔ آپ کی تمام کتابیں میرے پاس موجود ہیں۔ میں آپ کی کتابوں کا بہت مداح ہوں۔“

”شکریہ.....“ میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنزیہ ہو گیا۔ ”مداح بھی ہیں اور دشمن بھی.....“

”جی ہاں.....“ اس نے سوپ میں چمچ ہلاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور ہنسنے لگا۔

”آپ کے آدمیوں نے میری جان لینے میں کئی کئی سر نہیں اٹھا رکھی تھی اور آپ جو تجربہ مجھ پر کرنے والے تھے کیا وہ انسانیت سوز نہیں تھا؟“

”میں نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی تھی کہ آپ کو اس قدر خوفزدہ کیا جائے کہ آپ ڈھاکہ شہر چھوڑ جائیں اور میرے خلاف آپ کو منصوبہ بنا کر آئے تھے اس پر عمل نہ

کر سکیں اس لئے اگر پورٹ پر آپ کا تھانہ حملہ کیا گیا۔“

”تو کیا آپ کو میری ذات سے یہ خوف پیدا ہو گیا تھا کہ میں آپ کے لئے ایک زبردست خطرہ بن جاؤں گا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں!“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ پہلے گھص جیں جس نے میری تنظیم کو زبردست نقصان پہنچایا۔“

”اس کا اندازہ آپ کو میرے بارے میں کیوں کر اور کیسے ہوا جبکہ میری آپ سے کبھی کوئی ملاقات نہیں ہوئی؟“ میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”آپ کی کتابیں پڑھ کر۔“ وہ کہنے لگا۔ ”آپ جو اتنے بڑے شکاری ہیں جتنے وہ گھص تجربے کی بنا پر نہیں بلکہ ذہانت کی وجہ سے ہیں۔ آپ نے اپنی ذہانت کی وجہ سے بڑے بڑے خطرناک جانوروں کو زیر کیا ہے۔ آپ کی کون سی کتاب ایسی ہے جسے پڑھ کر میں عیش و عشر نہ کر سکا ہوں۔“

”میری آپ سے جو چھ سات گھنٹے جو ملاقات رہی ہے اس سے میں بھی آپ کی ذہانت سے بڑی خائف ہو گئی تھی اور مجھے اپنا منصوبہ نفل ہو تا دکھائی دیا تھا اگر میرا منصوبہ کامیاب نہ ہوتا تو پھر آپ یہاں نہ ہوتے اور پھر میری شامت آجاتی۔“

”میرا خیال ہے کہ ہم باتوں کی وجہ سے کھانے پینے سے انصاف نہیں کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر اویس بولا۔ ”باتیں کھانے کے بعد بھی ہو سکتی ہیں۔“

ڈاکٹر اویس نے غلط نہیں کہا تھا پھر میں انہیں خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو گئے، کھانا بہت عمدہ اور مزیدار تھا۔ میں نے کھانے کے دوران ڈاکٹر اویس کی غیر محسوس انداز سے تاقدار نہ جائزہ لیا۔ گودہ اویس عمر کا آدمی تھا گودہ جانوروں کی طرح صحت مند اور توانا تھا اس کی کپٹنی کے بالوں میں سے سفیدی کی چھابک رہی تھی وہ کسی آمر کی طرح دکھائی دے رہا تھا جو احکامات جاری کرنے کا عادی ہو تا ہے۔

کھانا ختم کرنے کے بعد ہم تینوں اٹھے اور صوفوں پر جا بیٹھے تو کمرے کے اندر ایک گھص داخل ہوا جو دیو قامت تھا میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی کوئی اتنے بلند قد کا آدمی دیکھا ہو اس کا جسم بھی فولادی طرح مضبوط تھا۔ قبض کی آستین میں اس کے بازوؤں کی پھلیوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ آدمی نہیں دیو ہے، وہ میرے برتن کھینچنے لگا تو میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ میرا دوچار غلام ہے۔“ ڈاکٹر اویس مجھے بتانے لگا۔ ”یہ میرے پاس پانچ



برس سے ہے اس کی وجہ سے کتنی مرتبہ میری جان بچ چکی ہے، مجھے اس پر جتنا بھروسہ ہے اتنا کسی اور پر نہیں۔“

اس وقت بالی ایک ٹرے میں کافی لے ہوئے آئی اور ہم سب کو کافی دے کر چلی گئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”ڈاکٹر اویس..... آپ کون سے ڈاکٹر ہیں؟.....“

آپ نے پناہ مانج ڈی کیا ہے یا.....“

”میں سرجن واکر ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں برس تک دنیا کے مختلف ہسپتالوں میں ملازمت کی ہے، ایک ہزار سے زائد بڑی کے آپریشن کر چکا ہوں، پھر میں اس پیشے سے انکار کر رہا تھا اس لئے کہ یہ میرا وطن اور سرزمین ہے۔“

”حیرت ہے، آپ ایک سرجن ہیں اور مقدس پیشے کے برخلاف انسانوں کا شکار کرتے ہیں اور ان کی زندگیوں سے کھیلے ہیں۔“

”کیا آج کل کے ڈاکٹر انسانوں کا شکار نہیں کرتے اور ان کی جانوں سے نہیں کھیلے؟“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر انسانیت کی بقا کے لئے کوشاں ہیں۔ وہ انسانوں کی خدمت کر رہے ہیں۔“

”آپ کو سی دنیا میں رہتے ہیں مسٹر سالار!“ ڈاکٹر نے ایک قہقہہ لگایا اور کافی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”آپ ڈاکٹر شکاری ہسپتالوں اور پرائیویٹ کلینک میں جا کر دیکھیں، آج کل کے ڈاکٹر ان کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں، کتنے لوگ مردہ ہیں، کتنوں کو تجربات کی ہیمنٹ چڑھاتے ہیں، کتنے مریضوں کی روزانہ کھال ادھیرتے ہیں، گاڑیاں خریدتے ہیں، غیر ممالک کی سیروسیاحت کو جاتے ہیں، کونھیاں اور بچکے بناتے ہیں۔ میں انسانوں کی جانوں سے کھلتا ہوں تو کیا بڑا کرتا ہوں۔“

”آپ نے کبھی شیر کا شکار نہیں کیا ہے؟“ میں نے اپنی کافی ختم کر کے تپائی پر گم رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”نہیں.....“ اس نے سر ہلایا۔ ”یہ آپ کس لئے پوچھ رہے ہیں؟ میں تو انسانوں کا شکاری ہوں۔“

”آپ اس لئے انسانوں کا شکار کرتے ہیں کہ آپ کو انسانوں سے زیادہ جانوروں سے محبت ہے۔“

”اس بات سے مجھے انکار نہیں۔“

”کیا کسی شکاری سے آپ کی ذات کو اس قدر شدید نقصان پہنچا ہے کہ آپ اس کا شکار اور اس کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کرنے پر مجبور ہو گئے۔“

”میں آپ کو شکاریوں سے اپنی شدید نفرت کی وجہ بتاتا ہوں۔“ اس کا چہرہ تھمتانے لگا۔ ”کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آپ بے زبان اور معصوم جانوروں پر گولیاں چلاتے ہیں۔ ان کے پیچھے دوڑتے ہیں ان کا دور تک تعاقب کر کے مارتے ہیں ان کی آزادی اور چین و سکون کی زندگی کو تھوہ بٹانا کر دیتے ہیں۔ کیا انہیں بے حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بھی انسانوں کی طرح ایک پرسکون زندگی گزاریں۔ مجھے اس لئے شکاری ایک اٹھل نہیں بھاتے ہیں۔ اسی لئے میں نے انہیں اس دنیا سے نیست و نابود کر دینے کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔“

”آپ ایک مذہب اور شائستہ آدمی ہیں لیکن معصوم اور بے گناہ انسانوں کے ساتھ ہیمنہ سلوک کرتے ہیں جو آپ کو ذریعہ نہیں دیتا۔“ میں نے تیز و تند لہجے میں کہا۔

”کیا یہ بات معصوم خیز نہیں ہے کہ آپ کو جانوروں پر رحم آتا ہے، انسانوں پر نہیں.....؟“

”مجھے انسانوں پر ترس اس لئے نہیں آتا کہ اس سے بڑا دہندہ اس کرؤ ارض پر کوئی نہیں۔“ وہ جذباتی ہونے لگا۔ ”میں آپ کو انسان کی درندگی کے ایک نہیں بلکہ ایک ہزار ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ سب سے پہلے جنگ کی مثال لیں اس جنگ کو کس نے جنم دیا؟ کیا انسان کے ہاتھوں نے اسے جنم نہیں دیا؟ آج دنیا کا سوا ایسا خطہ ہے جہاں انسان آپس میں جنگ نہیں لڑ رہا، وہ وحشی نہیں بنا ہوا۔ دنیا میں جتنے سنگین تہذیبی جرائم ہو رہے ہیں ان میں سب سے سنگین جرم جنگ ہے۔ کیا آپ ان جانوروں کی ایک ایسی جنگ بھی بتا سکتے ہیں جس سے انہوں نے انسانوں یا انسانی قوم میں تباہی پائی ہو۔ جانور تو جنگوں میں مذہب انسانوں کی طرح رہتے ہیں انہیں جو سکون اور چین نصیب ہے اس سے آج انسان محروم ہے۔ کیا انسان اس لائق ہے کہ اسے بخش دیا جائے؟“

”ہر کیف.....“ آپ انسانوں کو شکار کرنے کا سلسلہ آج سے ختم کریں۔ یہ میرا اخلصانہ مشورہ ہے۔“

”کیا کہا.....؟“ وہ حیرت سے اچھل پڑا، میں اس سلسلے کو ختم کر دوں جو دنیا میں بالکل نیا اور نوکھا سلسلہ ہے۔ اس انوکھے شکار کا سرا میرے سر ہے۔ کیا آپ یہ بات پورے وثوق سے بتا سکتے ہیں کہ شکاری تاریخ میں کسی نے ایسا دلچسپ اور سنسنی خیز شکار کھلایا جو جیسا میں کھلتا ہوں۔ میں نے شکار کے لئے جو جانور منتخب کیا ہے وہ سوائے میرے

ہو گا۔“

”ہاں.....“ ڈاکٹر ادیس نے ہنسا سر لایا۔ ”ایک طرح میں نے اپنی موت کو دعوت دی ہے لیکن مجھے اپنی موت کی پرواہ نہیں، میں موت سے نہیں ڈرتا کوئی شکاری موت سے خوفزدہ نہیں رہتا۔ ویسے اس شکار میں جو لطف آئے گا یہاں لطف میں ساری زندگی حاصل نہیں کر سکوں گا۔ مجھے اپنی فتح کی امید اس لئے ہے کہ آج تک مجھے ہاکا کی مانند دیکھنا نہیں پڑا۔ شکار میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکا۔“

”آپ کس شکاری بات کر رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کی.....“ بیگم جمال نے جواب دیا۔ ”ادیس آپ کے ساتھ شکار کھیلے گئے۔ پہلے تو ادیس آپ کے ساتھ شکار کھیلنے کے موڈ میں نہیں تھے اس لئے نہیں کہ انہیں موت کا خوف ہے۔ وہ آپ پر آنکھوں کی تبدیلی کا تجربہ کر کے شکار کھیلنا چاہتے تھے مگر اب انہیں زیادہ تاخیر پسند نہیں اور پھر ڈاکٹر قدرت خدا اپنی ٹیلی کے ساتھ پورے چلے گئے ہیں، معلوم نہیں وہ کب آئیں گے۔“

”میرا شکار کیا جائے گا؟“ میں نے اپنے سادے بدن پر ایک عجیب سی سنٹی محسوس کی۔ میں زبردستی مسکرایا۔ ”میں تیار ہوں۔“

”آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟“ بیگم جمال کے ہونٹوں پر سے بھی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ اس کے لمبے میں ہلکا سا تعارض تھا۔

”میرے محسوس کرنے کی بات کرنے سے کیا ہوتا ہے۔“ میں نے اپنی کے حسین چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔ ”یہ میرے صیاد کا حکم ہے کہ وہ میرا شکار کرے گا۔ میں اب تک شکاری رہا ہوں اور اب شکار دین کراہیک درد مندہ مفت شکاری کا مقابلہ کروں گا۔“

”آپ کو دردناک موت کے تصور سے کوئی خوف محسوس تو نہیں ہو رہا ہے؟“ اس نے دریافت کیا۔

”نہیں.....“ میں نے جواب دیا۔ ”موت سے میں نہیں ڈرتا ہوں اس لئے کہ اس کا ایک دن معین ہے۔ قدرت نے میری موت اس جنگل میں لکھی ہے تو میں لاکھ جتن کروں اس سے بچ نہ سکوں گا۔ نہیں تو پھر دس ڈاکٹر ادیس بھی میرا بال بیکا نہیں کر سکتے؟“

”وہ بے ہم دونوں میں سے کسی ایک کا یہ آخری شکار ہو گا۔“ ڈاکٹر ادیس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”اس لئے کہ یہ مقابلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک

جزیرے کے کسی اور جنگل میں پایا نہیں جاتا اور پھر میں خاص طور پر جانوروں کے شکاریوں کے ساتھ شکار کھیلنا اس لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ خوشی ایک شکاری ہوتے ہیں۔ شکاری کو شکار کرنے میں جو لطف آتا ہے عام آدمی کو نہیں ہے۔ بے چارے جانور اور ایک عام آدمی میں اتنی ذہانت نہیں ہوتی ہے۔ اسی لئے میں شکاریوں کو اغوا کرتا ہوں اور انہیں شکار بناتا ہوں۔ عام اور غیر شکاری آدمیوں سے میں بہت کم شکار کھیلتا ہوں اس کے لئے رامو ہوتا ہے۔“

”یہ شکار نہیں قتل ہے ڈاکٹر! مجھے غصہ آگیا۔“ یہ انسانوں کا ہیمنہ قتل ہے“ آپ اس بربریت اور دردندگی کو شکار کا نام نہ دیں۔“

”جب انسان کسی جنگل میں دوسرے انسان پر فتح پالیتا ہے۔ بڑی قومیں چھوٹی قوموں کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں تو آپ اسے قتل نہیں کہتے ہیں۔ اس قتل و غارت گری کو فتح کا نام دے دیتے ہیں۔“

”آپ کا یہ فلسفہ مجھے قائل نہیں کر سکتا ہے۔ قتل، قتل ہے۔ آپ کی سرشت میں دردندگی داخل ہو چکی ہے۔“ میں کے بغیر نہ رہ سکا۔

”کیا خیال ہے کافی کا ایک اور دور ہو جائے۔“ ڈاکٹر ادیس نے میری بات کا ذرا بھی بڑا نہیں بنایا۔ اس نے میرے جواب کا انتظار کے بغیر بیگم جمال کی طرف دیکھا۔ ”نورہ ڈارلنگ! تم اپنے خوبصورت ہاتھوں سے کافی بناؤ لطف آجائے گا۔ پلیز.....“

بیگم جمال اپنی جگہ سے اٹھی اور مسکراتی ہوئی دردازے کی طرف بڑھی تو اس نے کہا۔ ”بحث و محار سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ آپ کو کیا معلوم کہ انسانوں کے شکار میں کتنا لطف آتا ہے۔“

”میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ انسانوں کو شکار کرنے میں کیا لطف آتا ہے؟ ایک بدترین وحشتانہ فعل کو آپ کو لطف کا نام دے رہے ہیں؟“

”اس شکار میں لطف اس لئے آتا ہے کہ انسان سے زیادہ ذہین اور خطرناک دنیا میں کوئی جنس نہیں۔ آپ ایک شکاری ہونے کے ناتے یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ شکار کا اصل لطف خطرناک شکار کو شکار کرنے میں ہوتا ہے۔“

ہم دونوں میں بحث کا سلسلہ جاری تھا کہ بیگم جمال تین تک کافی بنا کر لے آئی۔ جب ہم کافی پینے لگے تو بیگم جمال نے کہا۔ ”ڈیڑا ادیس! اس مرتبہ تم نے جس شکار کا انتخاب کیا ہے وہ دنیا کا سب سے خطرناک ذہین اور ہوشیار شکار ہے۔ اس سے جہازا مقابلہ بڑا سخت

شکاری کتاب میرے کمرے کے دروازے کے باہر بٹھا تھا۔ وہ آہٹ پاتے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور مجھے دیکھتے ہی غصے لگا۔ میرے سارے بدن پر سنسنی دوڑ گئی۔

میں نے کھڑکی کے پاس جا کر پردہ ہٹا کر باہر بھاگتا تو کھٹات اور راستوں کی جٹیاں بند ہو چکی تھیں۔ خاموش فضا میرے کمرے کی چادر تان کر سو رہی تھی۔ ایک میں تھا جو جاگ رہا تھا۔ ادھر شاید انجم النصار جاگ رہی ہوگی۔ پھر میں بستر پر بیٹھ گیا اور دماغ کے اشتعال پر قابو پا کے حالات کا جائزہ لینے لگا۔ آج میں پہلی مرتبہ پھنسا تھا۔ اپنی زندگی میں کبھی ایسے بدترین حالات سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ وہ درندہ صفت شخص میرا شکار کر کے میرا گوشت بھون کر کھا جائے گا۔ میں ایسی دردناک اور بے ہیاکی موت سے دوچار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میں اس بے رحم، سنگ دلی اور وحشی شخص کے ہتھے کسی قیمت پر چڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس کے ہاتھوں سے مرنے کے بجائے ڈوب کر مرنا اوار تھا۔ مجھے اپنی آزادی خود ہی حاصل کرنا ہو گی۔ اس بے ضمیر اور تنگ انسانیت شخص کو کسی نہ کسی طرح قانون کے حوالے کرنا ہو گا۔ جب تک وہ چھانی پر نہیں لٹک جائے گا اس وقت تک مجھے جین نہیں آئے گا۔ نہ صرف اس غیبت سے بلکہ اس کے ایک ایک ساتھی سے انتقام لینے کے لئے مجھے زندہ رہنا ہو گا۔ ان سب کی وجہ سے نہ جانے کتنے بد نصیب یہاں پہنچ کر اس کی دردنگی اور بربریت کا نشانہ بن چکے ہیں اور نہ رہے ہیں۔

یہ باغیانہ خیالات میرے دماغ میں آندھیاں بن کر میرے وجود کو جیسے حس نس کر رہے تھے۔ میرا دماغ ایسا ہو رہا تھا جیسے چولے پر چڑھی کیتلی جس میں پانی ٹھکان رہا ہو۔ میں نے دل میں تیر کر لیا تھا کہ میں اس شیطان مردود کی قید سے نکل کر رہوں گا۔ میں اپنی قیمتی زندگی اس جگہ میں ایک بھجڑیے کے ہاتھوں ضائع نہیں کروں گا۔..... فرار کے منصوبے کے لئے مجھے صرف ایک شخص ساتھی کی ضرورت تھی۔ میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنے دنوں کے بعد میرے ساتھ شکار کھیلے گا۔

میں ایک گھنٹے تک سوچتا رہا کہ یہاں کے اپنے ساتھ ملاؤں اور اس پر بھروسہ کروں۔ اسے اپنے اعتماد میں لوں۔ رامو تو اس غیبت کا بخنجر نظر تھا۔ بیگم جمال اس کی دوست، محبوبہ اور دوست راست تھی۔ ایک مرتبہ اس سے میں فریب کھا چکا تھا۔ اب اسے اعتماد میں نہیں لیا جا سکتا تھا۔ پالی کے سوا کسی اور سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پالی..... میرے ذہن میں ایک کوئڈاسپاکا۔ پالی کوئی اعتماد میں لیا جا سکتا ہے۔ پالی بھی صرف جیسی ہی بد نصیب لڑکی ہے۔ اسے ٹوٹنے سے کچھ تو اندازہ ہو جائے گا۔ پالی کے خیال

فریقین میں سے کوئی موت کے منہ میں نہیں چلا جاتا۔ یہ مقابلہ نہ صرف خطرناک اور بے حد دلچسپ ہو گا بلکہ بے حد سنسنی خیز بھی، دنیا کے دو چوٹی کے شکاری ایک دوسرے کو شکار کریں گے۔ کیوں مضر سالار! آپ کا خیال کیا ہے؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟

میں نے اپنی کافی کا آخری گھونٹ لے کر گھ کو تپاتی پر رکھ دیا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس سخت مقابلہ میں دو شکاری دو مقابل ہوں گے۔ میں ابھی سے سوچ سوچ کر سنسنی محسوس کر رہا ہوں۔“

اسی وقت پالی کمرے میں داخل ہوئی تو ڈاکٹر اوڈین سے مجھ سے کہنا۔ ”مضر سالار! آج آپ بہت تھکے ہوئے ہیں اب آپ جا کر آرام کریں۔ صبح ناشتے کی میز پر ملاقات ہو گی۔ آپ پالی کے ساتھ جائیں دو آپ کو آپ کے کمرے تک پہنچا دیں گی۔“

میں ان دونوں کو شب بخیر کہہ کر پالی کے ساتھ اپنے کمرے میں پہنچا۔ ابھی مجھے کمرے میں پہنچا کر پالی گئی۔ میرے بستر پر سلیپنگ سوٹ تھا ہوا کھاندا۔ میں کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گیا۔ گویں بے حد تھکا ہوا تھا اور بستر پر ہی بے حد آرام دہا تھا گریڈ انکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میرے تصور میں انجم النصار کا چہرہ لہرا لے لگا۔ وہ انجم النصار جو میرا خواب اور میری فزول تھی۔ میری محبت اور میرے وجود کا زور میں اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کا خیال مجھے باور پریشان کر رہا تھا۔ وہ میری نہ اسرار کشدگی سے کتنی پریشان ہو گی اس کا مجھے احساس تھا۔ اس نے میری یاد میں رو در کر ہر حال کر لیا ہو گا۔ اس کا چین و سکون غارت ہو کر رہ گیا ہو گا۔ وہ بے آب ہاشی کی طرح میرے انتظار میں تڑپ رہی ہو گی۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ اس کے لئے کس قدر جان لیوا اور اذیت ناک ہو گا۔ کیا میں اس سے مل سکوں گا۔ اسے پاسکوں گا۔ اس درندہ صفت شخص سے بچ کر میں یہاں سے پاسکوں گا۔ مجھے یہاں سے ہر قیمت پر نکل جانا ہو گا۔ مجھے یہاں سے کس طرح رہائی مل سکتی ہے؟

میں یہاں سے فرار کے بارے میں تدبیر سوچنے لگا۔ یہاں سے فرار ہونا اس قدر آسان نہیں تھا یہاں شکاری کتنے تھے اور اس کے علاوہ بہت سارے بد معاش بھی تھے اور پھر میں یہاں کے محل وقوع سے واقف بھی نہیں تھا۔ جب تک میں ہر قسم کی معلومات حاصل نہ کر لوں اس وقت تک میرے لئے بہت مشکل تھا کہ فرار کا منصوبہ بنا سکوں۔

میں بے چینی سے بستر پر اس طرح کروٹیں بدلتا رہا جیسے انگادوں پر لٹ رہا ہوں۔ میں تھوڑی دیر تک کمرے میں ادھر ادھر مگھلتا رہا۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ کھل گیا مگر مجھے دوسرے ہی لمحے دروازہ بند کرنا پڑا اس لئے کہ راہدار میں دیو قامت

”آپ اس کی فکر نہ کریں“ میرے پاس سوہانے ہیں۔ اسے بیگم جمال سے ہی فرصت نہیں۔“ اس نے بے پردائی سے جواب دیا۔

”اچھا تو آپ اس وقت میرے پاس کس لئے آئی ہیں؟ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”میں..... میں اس لئے آئی ہوں کہ آپ کو مشورہ دوں کہ آپ اس کے ساتھ شکار کاکیل نہ کھیلیں بلکہ کسی نہ کسی طرح فرار ہو جائیں۔“

”آپ کے اس مشورے کا بہت بہت شکریہ.....“ میں ممنونیت سے بولا۔

”میں بھی اس وقت یہی سوچ رہا تھا۔“

”خدا کرے آپ یہاں سے بچ نکل جائے میں کامیاب ہو جائیں اور یہ شیطان کفر کردار کو پہنچے۔“

”کیا یہاں سے آج تک کوئی بچ نکلے میں کامیاب نہیں ہو سکا.....؟“

”یہاں سے صرف ایک شخص فرار ہوئے میں کامیاب ہو سکا تھا۔“ وہ کہنے لگی۔

”اس کے یہاں سے فرار ہونے میں میرا ہاتھ تھا۔ میں نے اس کی قدم قدم پر مدد کی تھی..... اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ زندہ سلامت یہاں سے بچ نکلا تو سیدھا پولیس کے پاس جائے گا..... پولیس کو جزیرے اور یہاں کے حالات کے بارے میں بتائے گا اور بد نصیب لوگوں کو رہائی دلائے گا مگر وہ اس جہم سے نجات پا کر ہم سب کو بھول گیا..... میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ ایک شخص اس قدر خود غرض بھی ہو سکتا ہے۔“

”کوئی بات ایسی ہوئی ہوگی جس کی وجہ سے وہ شخص قانون کی مدد حاصل کرنے میں ناکام رہا ہو گا..... اس شخص کا نام کیا تھا؟“

”مشتاق چوہدری.....؟ وہ تو فوت ہو گئے۔“ میں نے چونک کر کہا۔ ”وہ اپنے گھر کسی نہ کسی طرح پہنچے تو گئے تھے لیکن اس حالت میں کہ وہ زخموں سے چور تھے..... موت نے انہیں اتنی مہلت بھی نہیں دی کہ وہ کچھ بتا سکیں۔ ان کی موت میری نظروں کے سامنے ہوئی تھی۔ وہ صرف اتنا بتا سکے تھے کہ ایک انسانوں کا شکار ہے..... وہ انسانوں کو بھون کر کھا جاتا ہے۔ مرحوم میرے دوستوں میں سے تھے۔“

”ارہ..... مشتاق چوہدری چل رہے ہیں.....“ بالی کی آواز میں دھکم بھر گیا

”اس خبر سے اس کے دل کو صدمہ پہنچا۔“ مجھے ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی اس لئے

سے میرے اعصاب پھول کی طرح ہلکے ہو گئے اور میں اس طرح سے فریض ہو گیا جیسے اس نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا ہو۔

میں بستر پر سونے کے لئے لیٹا ہوا تھا کہ میں نے کمرے کے باہر بہت ہلکی سی آواز سنی۔

ایسے لگا جیسے کوئی آہستہ آہستہ چل رہا ہو۔ چند لمحوں کے بعد میرے کمرے کا دروازہ بے آواز کھلا۔ چونکہ میری نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں اس لئے میں نے دروازہ کھلنے

ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے بستر پر اٹھ بیٹھا۔ مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ وہ بالی تھی۔ جو میرے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

بالی دروازہ بند کر کے میرے پاس آئی۔ کمرے میں زیر پاؤں کا بلب جل رہا تھا۔

”آپ جاگ رہے ہیں مسٹر سالار!“

”فیضان خانہ میں کیسین نیند آتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پریشان کن خیالات مجھے سونے نہیں دے رہے ہیں۔“

”حیرت ہے آپ کو نیند اب تک کیوں نہیں آئی؟“ اس نے آہستگی سے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔“

”آپ نے غلط نہیں سنا۔“ میں نے اسے جھٹکنے کے لئے کہا تو وہ بستر پر میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ ”اچھا اب بات تو بتائیں کہ آپ کے خبیث باس نے مجھے اس قدر شائد ار کرے

میں کس لئے ٹھہرایا ہے جبکہ میں اس کا خطرناک ترین دشمن ہوں۔“

”وہ صرف شکاریوں کو ایسے کروں میں ٹھہراتا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ انہیں تین دن تک کسی شاہی مہمان کی طرح رکھتا ہے۔ وعدہ کھانے کھاتا ہے۔ ان کی ہر قسم کی خواہش پوری کرتا ہے۔ اگر آپ اس سے بیگم نعتہ جہاں، مجھے یا کسی بھی لڑکی کو جو اس

جزیرے پر ہے“ طلب کریں گے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ وہ شکار کا عید قربان کے جانور کی طرح خوب خیال رکھتا ہے تاکہ شکار تندرست و توانا ہو جائے اور شکار کرنے میں لطف آ سکے.....“

”آپ اتنی رات گئے میرے کمرے میں کس لئے آئی ہیں؟ کیا اس نے آپ کو میرے پاس بھیجا ہے.....؟“

”جی نہیں.....“ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔

”میں خود چوری چھپے آپ کے پاس آئی ہوں۔“

”اگر آپ کے پاس کو یہاں آنے کی خبر ہو گئی تو آپ کا کیا مشورہ ہو گا.....؟“

”ٹھیک ہے اب آپ جائیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیسں ایسا نہ ہو کہ رات کو کبھی جاگ جائے اور آپ پر کوئی مصیبت نازل ہو جائے۔“

”دن میں آپ کسی بھی جگہ پر اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات نہ کریں۔“ وہ بستر سے اتر کر سناڑھی کا پلہ درست کرنے لگی۔

”ہو سکے تو آپ کل رات اس وقت آجائیں میں آپ کا انتظار کروں گا۔“  
 ”کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ یہاں سے فرار ہوتے وقت مجھے بھی اپنے ساتھ لے  
 لیں؟“ اس نے میری طرف التجا بھری نظروں سے دیکھا۔

”یہ سب کچھ حالات پر منحصر ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”آپ خدا سے دعا کریں کہ اس اٹلیس کا میرے ہاتھوں خاتمہ ہو جائے اور ہم یہاں کی قید سے رہائی حاصل کر لیں۔ یہاں کوئی بد نصیب قیدی نہیں رہے۔“

”آمین.....“ اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے کہا۔  
 دفعتاً بہت دور سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں تو میں نے بالی کی طرف دیکھا۔  
 ”یہ گولیاں کیوں چل رہی ہیں؟“

”کسی بد نصیب قیدی نے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔“ اس نے بتایا۔ ”موت  
اس کا استقبال کر رہی ہے..... ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے۔ آخر آدمی کرے بھی تو کیا  
کرے اس غلامی سے تو موت ہی بہتر ہے۔“

تھوڑی دیر کے بعد باہلی چلی گئی تو میں سونے کے لئے ستر پر لیٹ گیا چوڑا کمر اوپر کے بارے میں سوچنے لگا جو انسانیت کی پیشانی پر پیدا ہوا غم تھا ہر اس شاعر کے کھیل کے بارے میں جو ڈاکٹر مجھ سے کھیلنا چاہتا تھا۔ ایک کھانا ڈانڈ موم اور قہقہہ کھیل، یہ انسانوں کا کھانا نہ تھا بلکہ ایک طرح سے وحشیانہ قتل تھا ایک ایسا خوفناک کھیل جو روم کے اکھاڑوں میں ہوتا تھا۔ ان اکھاڑوں میں خون کے پیاسے اترتے تھے ایک خون کی کھیل دو انسانوں کے درمیان شروع ہو جاتا تھا یہ کھیل اس وقت تک جاری رہتا تھا جب تک کوئی ستر سے جدا نہیں کر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ نیتے قیدیوں پر کئی دنوں کے بھوکے پیاسے درندوں کو چھوڑ دیا جاتا تھا جو انسانوں کو چرچہ بھڑکے کھا جاتے تھے۔ اب یہی خون کی کھیل یہ درندہ صفت شخص مجھ سے بھی کھیلنا چاہتا تھا میں اسی لئے یہاں سے فرار ہونے کی تدبیر سوچ رہا تھا۔

★ ★ ★ ★ ★

میں نے ان کے بارے میں غلط رائے قائم کی..... خدا مجھے معاف کرے۔“

”کیا آپ کے ذہن میں ایسا کوئی منصوبہ ہے کہ میں بھی مشتاق چوہدری کی طرح یہاں سے فرار ہو سکوں.....؟“

”میں آپ کو کل تک کچھ بتا سکوں گی۔“ وہ بولی۔ ”مشتاق چودھری کے فرار کے بعد سے یہاں بہت سختی ہو گئی ہے اسے اسی سختی کے باوجود کچھ قیدی فرار ہوئے کی کو مشعل کرتے ہیں مگر وہ سپرداروں کی گولیوں یا شکاری کیوں کی درندگی کا نشانہ بن جاتے ہیں۔“

”میرے ذہن میں فرار ہونے کی ایک تدبیر آ رہی ہے۔“ میں بولا۔ ”میں شکار کے دوران گھسے جنگل کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو سکتا ہوں۔“

”اے آسان نہیں بھتا آپ سمجھ رہے ہیں۔“ وہ گنگی لگی۔ ”کیا آپ کے خیال میں وہ اس محفل میں تھا ہو گا..... ہرگز نہیں“ وہ آتا بنگلہ ٹھنسنے کے کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ وہ انسان کے شکار کے لئے اپنے ساتھ رامو اور کتوں کو لے کر نکلا ہے وہ اپنے شکار کو بہانہ انداز سے شکار کر کے خوش ہوتا ہے۔ اس کی نظروں کے سامنے شکار جتنی تکلیف سے مرتا ہے، اسے اتنی ہی زیادہ خوشی ہوتی ہے وہ اس کی تکلیف دیکھ کر خوشی سے رقص کرنے لگتا ہے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ وہ تکمیل کے منصوبے بنائے اور اس دوران میں فراہم ہو جاؤں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”آپ فکر نہ کریں..... خدا ہماری مدد کرے گا..... کل میں ذرا یہاں کا محل وقوع دیکھ لیجئے پھر آپ سے مشورہ کر کے فراہم ہونے کا منصوبہ بنائوں گا آپ کی مدد کی قدم قدم پر ضرورت پڑے گی۔“

”مجھ سے جو تعاون ہو سکے گا وہ آپ سے کروں گی۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔

”مجھے اپنی ذات سے زیادہ ان بد نصیب قیدیوں کی فکر ہے جو ان درندوں کی درندگی کا نشانہ بننے والے ہیں..... ان کے لئے مجھے اپنی جان بھی دینا پڑے تو میں پیچھے نہیں ہوں گی۔“

”مجھے سب سے پہلے اسلحہ وغیرہ کی ضرورت پڑے گی۔“ میں بولا۔ ”کیا ریپورٹ لکھ رہا ہے؟“

”اس کا بندوبست کرنا میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ کو جتنے ریواں اور پستول کئے لادوں گی یہاں ایسے خوفناک اور زہریلے ہتھیار چاقو ہیں کہ آپ نے دیکھے بھی نہیں ہوں گے یہ چاقو ڈاکڑ اور ایسے خاص طور پر آؤڈے کرناور کئے ہیں۔“



مگر ہاتھ پھیرا تو اس نے اپنی ناک میرے ہاتھ پر لگا لی یہ ہم دونوں کی دوستی کا آغاز تھا میری  
میں نے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا تو وہ اپنی دماغی ہلانے لگا۔ ہم دونوں میں جیسے دوستی ہو گئی  
تھی۔

بالی نے میری طرف بڑی حیرت سے دیکھا۔ ”آپ نے تو اسے بہت جلدی اپنا  
دوست بنالیا..... اس کا نام موتی ہے۔“

”جانور محبت کے بھوکے ہوتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ اعلیٰ نسل کا کتا ہے  
اعلیٰ نسل کے کتے جتنے خطرناک ہوتے ہیں اتنے ہی وفادار اور انسان دوست بھی ہوتے  
ہیں دیسے میاں گل کتے کتنے موجود ہیں؟“

”تمہیں.....“ اس نے جواب دیا۔ ”ایک کتا تو رامو کا ہے جسے رامو ہر وقت  
ایک بہت بڑے بچے میں قید رکھتا ہے وہ کمرے سیاہ رنگ کا ہے بہت ہی زیادہ خوش خور  
اور خطرناک۔ وہ اسے کھارے کے وقت ساتھ لے کر نکلتا ہے۔ وہ اسے ٹانگیں کھتا ہے وہ ہے  
بھی ٹانگیں کی طرح تیسرا کتا نوبی ہے وہ بھی موتی جیسا ہی ہے اور صدر دروازے پر پہرہ دیتا  
ہے۔“

میں نے چھ سات قدم چلنے کے بعد رک کر موتی کی طرف دیکھا۔ موتی میرے کمرے  
کے دروازے کے پاس کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے اشارے سے بلاتے  
ہوئے پکارا۔ ”موتی..... ادھر آؤ..... موتی!“

دوسرے لمحے موتی لپک کر میرے پاس آیا تو میں نے اسے سے کہہ: ”شاباش بیٹھ  
جاؤ.....“

موتی نے میرے ہجیم کی قہقہہ کی تو بالی ششدر رہ گئی۔ ”نا قابل یقین.....  
میری اس سے دوستی ہونے میں دس دن لگے ہیں۔“

”اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ جانوروں سے دوستی کرنے کے فن سے ناواقف ہیں۔“  
میں نے اس سے کہا۔

”اگر آپ نوبی سے بھی دوستی کر لیں تو.....“ وہ سرگوشی میں بولی اور اس  
نے اپنا جملہ ادھر راہجوڑ دیا۔

میں اس کی بات کی تردید میں بیچ بیچا۔ ”میں کوشش کروں گا شرط موقع ملے گی ہے۔“  
میں بالی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو ہمیں بھال اور ڈاکڑاویں ناشتے کی میز پر  
میرے ختہ تھے۔ ڈاکڑاویں اپنی کرسی چھوڑ کر میرے استقبال کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اس

نہ نے مجھے اچانک اس طرح دبوچ لیا کہ خبر تک نہ ہو سکی میں دیر تک سوتا رہتا اگر  
بالی مجھے نیند سے بیدار نہ کرتی وہ میرے لئے بیڈی لے کر آتی ہوتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا  
کہ میں ٹھیک نو بجے ناشتے کی میز پر جانے کے لئے تیار رہوں۔ وہ مجھے آکر لے جائے گی۔  
اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے وہ بیڈی نہ پائی پر رکھ کر چلی گئی تو میں نے غسل خانے میں  
جا کر پانی سے ہلکی کی، کمرے میں آکر چائے لے کر کھڑکی کے پاس چلا گیا کھڑکی کے پڑے ہٹا  
کر باہر جھانکا تو نظروں کے سامنے ایک دلکش نظارہ تھا سورج کی کرنیں چاروں طرف سونا  
لا رہی تھیں یوں بھی جاڑے کی صبح بہت حسین ہوتی ہے۔ سامنے دریا تھا جس کی لہریں  
سبک خراہی سے بہہ رہی تھیں۔ بائیں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا اس عمارت  
کے قریب گھاٹ تھا جس پر دو جدید ترین لانچیں اور چھ سات موٹر بولس کھڑی تھیں۔ ان  
لانچوں میں سے ایک لانچ وہ تھی جس میں ہم لوگ گاؤں کے سوار ہو کر فرار ہوئے تھے۔  
عجیب سی بات یہ تھی کہ ڈاکڑاویں نے اپنے اس اڈے کی تباہی بندو اور جعفر کے قتل پر  
کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کا سرسری اندازہ بھی بتا کر دیا۔ دائیں طرف بہت  
دور اونچے اونچے درختوں کا سلسلہ شروع ہوتا نظر آیا یہ جنگل تھا میں نے جنگل شروع  
ہوتا تھا اور میں نے ہمیں آس پاس کہیں نہ پائی تھی۔ میں اس عمارت کے محل وقوع کو ذہن  
نشین کر لے گا۔

میں نے اتنا تو اندازہ کر لیا تھا کہ یہ عمارت حویلی نما ہے میں اس عمارت کی بالائی منزل  
پر ہوں یہ عمارت کسی محل کی مانند ہے اس کی تعمیر بہت پیسہ خرچ کیا گیا تھا۔ اس کے پاس  
اس قدر دولت کہاں سے آئی، کیسے آئی مجھے اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ یہ ایک جہنمی درندہ تھا  
جس نے اپنی تسکین کے لئے اس جہیز سے پر اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی جس کی دنیا کو  
بالکل خبر نہ تھی۔

ٹھیک نو بجے بالی مجھے لینے آگئی کمرے کے باہر شکاری دیو قامت کتا موجود تھا میں نے  
اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو اس نے نہانہ میری طرف بڑھایا میں نے پارسے اس کے

ناشتہ پر تکلف تھا اور اس کی مقدار آٹھ دس آدمیوں کے لئے کافی تھی۔ ناشتے میں حلوہ، پوری، آلو کی بھجیا، پراٹھے، فرائی قیمہ، ہاف فرائی انڈے، چکن سوپ اور سلائس

ہیں۔ جب بھی بڑے طوفان اور سیلاب آتے ہیں تو یہ غریب کتوں کی موت مرجاتے ہیں۔ ان کے بے گھر و گھن لاشیں پانی میں تھرتی اور سڑتی رہتی ہیں۔“

”حیرت کی بات ہے..... آپ کو انسانوں سے محبت ہے اور ان کے ساتھ نیکی بھی کرتے ہیں۔“ میں نے چونک کر اس کی شکل دیکھی اس کے چرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ ”آپ محبت‘ نیکی اور انسانیت کے منہوم سے آشنا ہیں کیا آپ کے سینے میں دل نام کی کوئی چیز ہے؟“

”میں ابھی چل کر آپ کو اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں کہ میں کیسا دردمند انسان ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”ہی دل کی بات وہ میرے پاس ہے کہاں.....؟ اسے میں نے نیگم جنال کے پاس رہن رکھ دیا ہے۔“

جب ناشکر کے اٹھے تو وہ مجھے اپنے ساتھ ایک بہت ہی بڑے اور آراستہ و بیزارست کمرے میں لے آیا۔ یہ کمرہ اس کا دفتر تھا جو اسی عمارت کے ایک حصے میں واقع تھا اور اس کی خواب گاہ کے قریب تھا۔ ایک بڑی اور خوبصورت سی ہیز تھی جس پر تین ٹیلیفون رکھے تھے جو مختلف رنگوں کے تھے دوسری طرف دو تین فائلیں تھیں‘ ایٹش ٹرے اور قلمدان بھی منوجو دتے ایک طرف سٹیل کی الماری اور بہت بڑی توبھی بھی تھی میز کے گرد وچہ کرسیاں ملاقاتیوں کے لئے تھیں ایک ریوالونگ چیر چیئر جس پر وہ بیٹھا تھا۔

”یہ میرا دفتر جہاں سے میں اپنے ساتھیوں کو احکامات جاری کرتا ہوں اور انہیں کنٹرول بھی کرتا ہوں۔“

”آپ کے آدی آپ سے اس پتے پر رابطہ قائم کرتے ہیں؟“

”جی ہاں..... ان کے پاس میرے ٹیلیفون نمبرز ہیں میرے جزیے میں ٹیلیفون کا ایک جال پھیلا ہوا ہے مجھے رتی رتی باتوں کی خبر جی رہتی ہے۔ دو آدی جن کا کمرہ دوسری عمارت میں ہے‘ وہ وہاں ہر وقت ٹیلیفون کے پاس موجود ہوتے ہیں کوئی بھی اہم بات ہو تو مجھے بغیر کسی تاخیر کے اطلاع مل جاتی ہے۔“

”کیا آپ کے پاس اپنے تمام آدیوں کا ریکارڈ موجود ہے کہ کون کہاں ہے اور کس کام پر مامور ہے۔“

”جی ہاں..... نام اور پتے مع تصویروں کے..... ان کی فائلیں اس تجویزی میں بند ہیں..... آپ یہ کس لئے پوچھ رہے ہیں۔“

”اس لئے کہ آپ پر فتح پانے کے بعد آپ کے گردہ کا قلع قمع کیا جاسکے۔“

”وہ.....“ وہ ہنسنے لگا۔ ”آپ کو اپنی کامیابی کی بڑی امید ہے آخر یہ توقع کیونکر ہے؟“

”اس لئے کہ مجھے خدا کی ذات پر بھروسہ ہے۔“

”خدا پر.....“ اس نے استہزائی لہجے میں کہا۔ ”اس خدا پر جو انسانوں کا سب سے بڑا اور اڑتی دشمن ہے۔ اسے انسانوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے۔ وہ دنیا کے لوگوں کو جس بے رحمی سے مارتا ہے اور غارت کرتا ہے اس پر آپ بھروسہ کر رہے ہیں۔“

”انسان خود اپنے اعمال کے سبب تباہی و بربادی کی کھائی میں جاگرتا ہے ان کی تباہی کا وہ ذمہ دار نہیں ہوتا ہے وہ تو جہیم و کریم ہے جس نے بھی اسے مصیبت میں پکارا اس نے مدد کی..... وہ انسان کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔“

”آپ خدا پر بھروسہ کریں اور میں اپنے بازوؤں پر‘ میں دیکھتا ہوں خدا آپ کی کس طرح مدد کرتا ہے۔“

”یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ..... خدا کس طرح مصیبت میں کام آتا ہے..... مجھے اس کی ذات پر بھروسہ ہے اور آخری سانس تک رہے گا۔“

”اس سے پہلے جو شکاری میرے مقابلے پر آئے تھے خدا نے ان کی مدد کس لئے نہیں کی.....“ آخر وہ بھی تو مصیبت زدہ تھے۔“

”انہوں نے خدا پر نہیں اپنے بازوؤں پر بھروسہ کیا ہو گا‘ ابھی مصیبت میں اسے نہیں پکارا ہو گا۔“

”ہر کیف..... میں نے انہیں آپ کے خدا کے پاس بھیج دیا ہے..... آپ بھی وہاں جانے کے لئے تیار رہیں۔“

”میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”پوچھیے۔“

”میں نے سنا ہے کہ آپ آدم خور ہیں..... انسانوں کا گوشت پکا کر اور بھون کے کھا کھاتے ہیں کیا یہ سچ ہے؟“

”یہ بات بالکل سچ ہے۔“ وہ کہنے لگا۔ ”انسان کا گوشت جتنا لذیذ اور مزیدار ہو تا ہے اتنا کسی بھی جاندار کا نہیں ہوتا‘ ایک بار منہ کو لگ جائے تو پھر چھوٹا ہی نہیں۔ میں نے سب سے پہلے انسان کا گوشت افریقہ کے ایک جنگل میں کھایا تھا میرے افریقی میزبان نے مجھے

دھوکے سے کھلا دیا تھا۔

”آپ وہیں رہ جاتے۔“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”وہاں کے آدم خوروں میں ایک اور آدم خور کا اضافہ تو ہو جاتا۔“

”اگر میں وہاں رہتا تو میرا میزبان ہی مجھے کھا جاتا اس لئے میں وہاں سے چلا آیا۔“ وہ ہنسنے لگا۔

میں مسکرا دیا۔ ”اگر ایسا ہو تا تو اس افریقائی کائنات پر بہت بڑا احسان ہو تا۔ آج یہاں کے لوگ آپ کی زندگی کا شائد تو نہیں بنتے۔“

”آپ ایک مرتبہ انسان کا گوشت کھا کر تو دیکھیں۔“ وہ کہنے لگا۔ ”پھر آپ بھی میری طرح آدم خور بن جائیں گے۔ کیا خیال ہے آج کی رات، رات کے کھانے میں اس کا اہتمام کرادوں..... رامو بھی بڑے شوق سے اور رغبت سے انسان کا گوشت کھاتا ہے۔“

”کیا انسان کو انسان کا گوشت کھانا زیب دیتا ہے۔“ میں نے اس کی طرف حقارت سے دیکھا۔ ”مجھے تو آپ معاف رکھیں۔“

”کیا آج کل انسان، انسان کو نہیں کھارا؟“ وہ بڑے اطمینان سے کہنے لگا۔ ”اگر میں بھی انسانوں کو کھاتا ہوں تو کوئی جرم تو نہیں کر رہا۔ کیا بڑی پھللی پھللی کو ٹنگل نہیں جاتی؟ کیا بڑی اور مذہب قومیں پھللی اور پسماندہ قوموں کو معاشی اور اقتصادی طور پر ہڑپ نہیں کر رہی ہیں اور ان کا خون چوس چوس کر انہیں مار نہیں رہی ہیں؟ اگر میں ان کے نقش قدم پر چل رہا ہوں تو اس میں حیرت اور حقارت کی کیا بات ہے؟“

پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر دفتر کے کمرے سے نکلا چند دم پر ایک کمرہ تھا جس کے سامنے بیچ کر رک گیا اس کمرے کے دروازے پر ایک خوبصورت سی پلاسٹک کی سختی نصب تھی جس پر ”لابریری“ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ دروازے پر تالا لگا ہوا وہ اپنی جیب سے چابیوں کا کچھا نکالتے ہوئے بولا۔ ”مسٹر سالار! میں آپ کو آپ کے ہم پیشہ، ہم ذوق دوستوں سے ملاتا ہوں۔“

”کیا آپ نے انہیں یہاں قید کر رکھا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”قید نہیں کیا ہوا ہے۔“ اس نے تالا کھولتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے انہیں اس کمرے کی بینت بنا کر رکھا ہے میں انہیں روز دیکھتا ہوں اور ان سے ملتا ہوں۔ آپ بھی ان سے مل لیں پرانی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔“

اس نے کمرے کا دروازہ کھولنے کے بعد مجھے کمرے میں داخل ہونے کی دعوت دی میں کمرے میں اس کے پیچھے پیچھے داخل ہوا یہ ایک ہال نما کمرہ تھا، اس میں لکھنے پڑھنے کی میز کے علاوہ الماریاں اور شیفٹ بھی تھے جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ اسے مطالعہ کا حد سے زیادہ شوق تھا۔ میں نے کمرے کا پوری طرح جائزہ لیا تو میرے سارے بدن میں دہشت کی لہر خنجر کی طرح کاٹی ہوئی آگ بنی ہوئی غش سا کھا گیا۔

میں نے اپنی ساری زندگی میں کبھی اس قدر لرزہ خیز دہشت ناک اور بھیماک منظر نہیں دیکھا جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے ہوں۔ اس کمرے کی دیواروں پر چاروں طرف انسانی سرسے ہوئے تھے۔ میں ان سروں کو خوب اچھی طرح پہچانتا تھا ان سروں میں کئی سرو تو میرے شکاری دوستوں کے تھے۔ صرف دو تین چہرے میرے لئے نا آشنا تھے۔

میں دیوار کا سارا دینا لیتا تو اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے دل کی عجیب سی حالت ہونے لگی تھی۔ ایک ایسا لگا رہا تھا جیسے وہ اندر ہی اندر رڈوب رہا ہو سینے میں دہشت اور خوف سے دھک دھک سی ہونے لگی تھی۔ جسم کا سارا خون جیسے نچوڑ لیا گیا تھا میں نے بڑبڑا کر کے سارے کھڑے ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یہ بھیماک نظارہ مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

”یہ ہیں آپ کے شکاری دوست.....“ اس کی استہزائی آواز میرے کانوں میں سیسہ بن کر کھینچنے لگی۔ میں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا تو وہ میری طرف متنی خیز انداز سے مسکراتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ”ان سروں میں صرف آپ کے ایک سر کی کمی رہ گئی ہے؟ آپ کا اسراس کمرے میں جج جائے تو میرے لئے بڑی مسرت کی بات ہوگی اس لائبریری میں چار چاند لگ جائیں گے۔“

میرے لئے یہ نظارہ دیکھنا اور پیروں پر کھڑے رہنا دشوار ہو رہا تھا اور میرا جی باش کرنے لگا تو میں کمرے سے نکل آیا وہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلا آیا اس نے دروازے پر تالا لگاتے ہوئے کہا۔ ”آج شام تک جہاں تک دیکھا دیکھا کر رہا ہے آج آجائے گا۔“

”آج کے مذہب دور میں آپ جیسا شقی القلب شخص کوئی نہیں ہوگا۔“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”یہ انسانی سر آپ نے کس لئے جمار کئے ہیں؟“

”یہ انسانی سر دراصل میرے عظیم کامناہوں کے ثبوت ہیں۔“ وہ خمرے سے تانے لگا۔

”شکار کے کھیل میں،“ میں نے انہیں زبردست ہلکت دی۔ ”مجھے تو حیات آسانی سے حاصل

نہیں ہوئی ہیں۔ اس نے زبردست محرکہ آرائی ہوئی۔ میں بھی موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا ہوں۔ یہ سر نہیں ہیں یہ تو میری بھادری کے تحفے ہیں جو میں نے یہاں سجا رکھے ہیں۔ اب مجھے ایک سب سے بڑا تہذ اور حاصل کرنا ہے جس کی مجھے بڑی قننا ہے۔

”وہ کون سا تہذ ہے؟“ میری زبان سے ہلا ارادہ نکل گیا۔

”آپ کا سر..... ایک عالمی شہرت یافتہ شکاری کا سر..... اس کا حصول میری زندگی کا سب سے بڑا اور عظیم کارنامہ ہو گا۔“

”خدا کے لئے اب تو آپ انسان بن جائیں ڈاکٹر اویس!“ میرے سارے بدن پر جھر جھری سی آگئی۔ ”انسان کو انسان ہی رہنا چاہئے۔“

”آپ کو میں اپنا ایک اور عظیم کارنامہ دکھاؤں جو دنیا میں آج تک کوئی انجام نہیں دے سکا۔ میرے ساتھ آئیے.....“ اس نے میری بات سنی اس کی سنی کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں اس عمارت سے باہر آئے۔ یہ عظیم الشان عمارت میرے اندازے کے مطابق کسی محل کی طرح تھی۔ اس عمارت کے عقب میں ایک اور عمارت تھی جو کسی اسکول کی عمارت سے مشابہ تھی۔ اس کے نیچے اور اوپر بہت سارے کمرے بنے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے اس عمارت کی طرف لے کر بڑھا۔

اس عمارت کے باہر ایک مسلح شخص پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے مستعد ہو کر سلام کیا۔ اس عمارت کے اندر داخل ہوتے ہی وہ ایک کمرے کے سامنے رگ گیا جس کے اندر سے کھٹ کھٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ایک چھوٹا سا جوٹو کا کارخانہ تھا۔ اس میں پانچ پچھ اوچیز عمر کے آدمی جوتے بنانے اور ان کی سلائی کرنے میں مصروف تھے۔ ایک الماری میں جوتوں کی آٹھ دس جوڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں چمڑے کے چھوٹے بڑے ٹکڑے رکھے تھے۔

ان آدمیوں میں سے دو ایک نے اپنا سر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور اپنے کام مصروف ہو گئے۔ ان کے چروں پر گہری اداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ مریضوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکٹر اویس الماری کے پاس جا کر رکھا اور اس نے جوتوں کی ایک جوڑی نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ ”آپ نے اپنی زندگی میں کبھی ایسے جوتے دیکھے ہیں؟“

میں نے جوتوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ بڑے نفیس جوتے بالکل ایسے ہی تھے جو میرے ایک مداح نے مجھے تحفے میں دیئے تھے جس کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ یہ برما کے ایک جانور کی کھال کے بنے ہوئے ہیں بڑے نفیس جوتے تھے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”میرے پاس

ایسے ہی جوتوں کی ایک جوڑی ہے جو میرے ایک مداح نے تحفے میں دی تھی۔“

”اچھا.....“ وہ مسکرایا۔ ”وہ جوتے بھی اس کارخانے کے بنے ہوئے ہیں۔“

”میں نے سنا کہ جو شخص سال میں ایک مرتبہ یہ جوتے لاکر فروخت کرتا ہے وہ ہر ماہ ۲۲۴ ہے۔“ میں بولا۔ ”یہ کس بری جانور کی کھال کے ہیں۔“

”یہ ہم نے کسی وجہ سے ایسا مشہور کر رکھا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ جوتے صرف اور صرف میرے کارخانے میں بنے ہیں۔ یہ جوتے کسی جانور کی کھال کے نہیں ہیں، انسانی کھال کے بنے ہوئے ہیں.....“

”انسانی کھال کے.....“ جوتے میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑے۔

”میں نے سنا تھا سچا کہا۔“

”سو فیصد انسانی کھال کے جوتے ہیں۔“ اس نے جبکہ کر فرش پر سے جوتے اٹھا لئے۔ ”انسانی کھال سے جوتے بنانے کے بارے میں میرے ذہن میں سب سے پہلے یہ خیال آیا۔ پھر میں نے اس مقصد کے تحت ایک ٹیئری قائم کی۔ پھر ان کاروباروں کو نکلتے سے ڈھوکے اور قریب سے لاکر یہاں قید کرنا پڑا۔ یہ سچ آدمی ٹیئری کے کام کے علاوہ جنت مازی کے بھی ماہر ہیں۔ ان کی صلاحیت، قابلیت اور مہارت کی وجہ سے انسانی کھالوں کے جوتے بنے گئے۔ دنیا کے کسی گوشے میں انسانی کھال کے جوتے بننے ہیں اور نہ کوئی بنا سکتا ہے۔ یہ اعزاز بھی مجھے حاصل ہے۔“

مجھے اپنی ساعت پر یقین نہیں آیا مگر یہ ایک تلخ اور انتہائی بھیاںک حقیقت تھی۔ یہ انسانی کھال ہی سے بنے ہوئے جوتے تھے۔ ایسی ملائم نفیس اور خوبصورت کھال کسی جانور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تھوڑی دیر پہنک ایک جگہ دم بخود کھڑا ہوا جہاں پہنی نظروں سے اس کارخانے کا جائزہ لیتا رہا۔ ایک طرف مختلف رنگوں کی کھالوں کا ڈھیر تھا، یہ کاربگر تھے جو بڑی مشاقق اور مہارت سے جوتے بنا رہے تھے اور سلائی کر رہے تھے۔ جوتے الماریوں میں بچے ہوئے تھے۔

”اسی انسانی کھالیں آپ کو کہاں سے مل جاتی ہیں.....؟“ میں نے تھیر زدہ لہجے میں پوچھا۔

”کیا اس دیش میں انسانوں کی کوئی کمی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”سیلاب اور طوفانوں میں جو لوگ مرجاتے ہیں جن کی لاشیں ندیوں اور دریاؤں میں بہنے لگتی ہیں اس



۲۰- انہیں اس بات کا موقع فراہم کیا جاتا ہے کہ وہ اگر بچ کر نکل سکتے ہیں تو نکل جائیں۔ اب تک کوئی شخص ایسا خوش نصیب نہیں نکلا جس نے یہاں سے نجات حاصل کر لی اور اور اپنے گھر پہنچا۔

اس کے ساتھ جو کمرہ تھا اس میں دو مسلح شخص بیٹھے تاش کے کھیل اور کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس کمرے کی ایک الماری میں بت سارے چاقو، پھریاں اور پھرے رکھے تھے۔ یہ وہ مال تھا جو انہوں اور شیروں سے حاصل کیا گیا تھا یہ دونوں شخص اس فارت کے گھر ان تھے۔ دوسری الماری میں بندوقیں اور درختائیں تھیں جو ان پر نصیب شکاریوں کی تھیں جو اس کا شکار رہتے تھے۔

کوئے میں جو کمرہ تھا وہ سب سے بڑا تھا اور یہ بھی ایک جیل خانہ ہی تھا۔ اس میں لاکیاں اور عورتیں بند تھیں جن کی عمریں بارہ سال سے لے کر تیس برس کی تھیں۔ وہ بے حد فلکیں، متوحش، پریشان اور مردھانے ہوئے چھوٹوں کی طرح لگ رہی تھیں پھر بھی ان کے حسن و جمال میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ان میں جو لڑکیاں اور عورتیں بنی قیدی تھیں ان کی حسین آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں جیسے ساری آلات روٹی رہی ہوں۔ وہ سب کی سب بے بس ہرینوں کی طرح سہمی ہوئی تھیں۔ ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں جیسے غم بخشنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ان پر نصیب لڑکیوں اور عورتوں کو کچھ کر میرے دل کو کمرے صدمے کا سا احساس ہوا۔

جب ان لڑکیوں اور عورتوں نے ہم دونوں کو دیکھا تو ایک ایک کر کے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر وہ سلاخوں کے پاس آکر انہیں پکڑنے لگیں۔ ان کے چہرے نفرت اور غصے سے تھماٹھے تھے اور آنکھوں سے فٹلے برسنے لگے تھے۔ ان میں دو تین لڑکیاں ایسی تھیں جو اس سے منت سناہت کرنے لگی تھیں کہ وہ انہیں اس جہنم سے آزاد کر دے۔ باقی لڑکیاں اور عورتیں اسے بد دعائیں دینے لگیں۔ ان کا اس چناؤ وہ اس غیبت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتیں۔ وہاں چند لمحے کھڑے رہنا بھی دودھ بھرنے لگا تھا۔

پھر وہ مجھے اس کمرے اور عمارت سے لے کر باہر آگیا۔ اس نے دفتری طرف واپس جاتے ہوئے بتایا کہ یہ لڑکیاں اور عورتیں اس کی دل بھنگی کے لئے ہیں۔ بیکم بھال جب منشیات کی خرید و فروخت اور کسی مشق پر چل جاتی تو ہے ان میں سے کوئی اس کی جگہ لے لیتی تھی۔ اس نے ایسی لڑکیوں اور عورتوں کو جو بد صورت اور بے کشش تھیں انہیں دوسرے کمرے میں بند رکھا تھا اور وہ اس کے ساتھیوں کی خدمت کے لئے وقف تھیں۔

وقت ان لاشوں کو یہاں لایا جاتا ہے۔ یہ یزبن ہوتا ہے انسانی کھالوں کے حصول کا، پھر یہ مشین سے انسان کی کھال کو اتار لیتے ہیں۔ پھر یہ کھالیں ٹیڑی میں چلی جاتی ہیں۔ میں نے اس مقصد کے لئے ایک جدید ترین پلانٹ لگا رکھا ہے۔ کیا آپ یہ دیکھنا پسند کریں گے جس سے کھال کس طرح اتاری جاتی ہے؟

”جی نہیں.....“ ایک سرورلمیری ریڈہ کی ہڈی میں اتر گئی۔ ”بالفرض حال یہ کھالیں ختم ہو جاتی ہیں تو آپ کیا کرتے ہیں؟ طوفان اور سیلاب ہر سال نہیں آتے ہیں اور ایک سال کا عرصہ درمیان میں ہوتا ہے۔ کیا کھالیں ختم ہونے پر سیلاب اور طوفان کا انتظار کیا جاتا ہے؟“

”جی نہیں.....“ وہ سفاک لہجے میں بولا۔ ”میں اور رامو ہر دو ایک دن میں انسانوں کا شکار کھیلتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ روز ہی شکار کھیلتا پڑتا ہے۔ لہذا کھالوں کی کوئی کمی نہیں رہتی ہے۔ کھالیں جو تے بناتے اور گوشت، تیرے اور رامو کے کام آجاتا ہے۔ آپ کے دوست شکاریوں کی کھالوں کے جو تے بھی بن کر فروخت ہو چکے ہیں۔ میں اپنا مال غیر ممالک بھی بیچتا ہوں۔ یہ ایسا منافع بخش کاروبار ہے کہ کیا بتاؤں۔ یہ جو تے بڑے بڑے لوگ منہ لگا کر خریدتے اور پہنتے ہیں۔“

”کیا یہ جو تے خریدنے والوں کو بتایا جاتا ہے کہ یہ انسانی کھال سے بنے ہوئے ہیں؟“

”جی نہیں.....“ وہ بولا۔ ”اگر بتا دیا جائے تو پھر ان جو توں کا فروخت ہونا بند ہو جائے اور شامت آجائے۔“

وہ مجھے اپنے ساتھ خلع کر دوسرے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ وہاں دو تین ادھیڑ عمری عورتیں بیرونی کی پڑیاں بنا کر انہیں ایک بہت چھوٹی پلاسٹک تھیلی میں پیک کر رہی تھیں۔ اس نے بتایا کہ یہ بیرونی ہے جو کراچی سے لائی جاتی ہے اور یہاں سے بھارت جاتی ہے۔ اس کے آدمی منگوا کر اور وہاں تک وغیرہ بھی لے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ آمدنی منشیات ہی سے ہوتی ہے۔

پھر تیرے کمرے میں پہنچے تو یہ ایک جیل خانہ تھا یہ کمرہ بال نما تھا اور لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ اس میں کوئی چالیس پچاس کے قریب قیدی ہوں گے۔ ان میں بیس سال سے لے کر چالیس برس تک کی عمر کے مرد تھے۔ ان کی حالت مردوں سے بھی بدتر تھی۔ اس نے بتایا کہ ان میں سے روزانہ دو تین مردوں کو شکار کے کھیل کے لئے منتخب کیا

اور گولیاں بھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یہاں سے فرار کا منصوبہ بنانا بہت مشکل ہے۔ فرار کی ایک ہی صورت ہے کہ شکار کے دوران جنگل ہی سے فرار ہونے کی کوشش کروں۔ یہاں میں جنوب میں درختوں کے بیچ ایک کنیا ہے۔ اس کنیائیں اگر کوئی آدمی موجود ہے تو اس کا مطلب ہے ہوا کہ دریا کے کنارے کوئی موزیوٹ کھڑی ہے۔ ویسے اس کنیائیں ایک آدمی ضرور ہوا ہے اس لئے کہ اگر کوئی شکار افاق سے چلتا پھرتا دھڑاٹکے تو وہ آدمی جسے فوراً قتل کر دے۔

بالائی نے مجھے جو نقشہ دیا تھا وہ اس لئے تھا کہ میں اس نقشے کی مدد سے نہ صرف یہاں سے فرار ہو کر کسی قریبی بڑے شہر میں پہنچ جاؤں بلکہ یہ نقشہ آدیس کے حوالے بھی کر دوں تاکہ پولیس فوری طور پر کارروائی کر کے بد نصیب اور ستم زدہ لوگوں کو اس جہنم سے نکالے۔

بالی زیادہ دیر نہیں رکھ سکا کیونکہ بیگم جمال سے اس کی جان کو سخت خطرہ لاحق ہو چکا تھا اور وہ اس کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی۔ وہ بیگم جمال کے خوف کی وجہ سے میرے ساتھ فرار ہو کر میرے لئے کوئی مصیبت کھڑی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے انہوں نے مجھے شکار کے دوران ہی فرار ہونے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ منصوبہ زیادہ آسان تھا۔

صبح بالی میرے لئے بیڈنی لے کر آئی تو اس نے مجھ سے کہا کہ رات اس کے ذہن میں ایک نادر تدبیر آئی ہے کہ شکار والے روز وہ توں کو کسی نہ کسی طرح بے چھوٹی کی دوا کھلا دے گی۔ کتے دوئی کھانے کے ایک دو گھنٹے کے بعد جنگل میں کسی جگہ بے ہوش ہو جائیں گے۔ اس طرح ایک بہت بڑا خطرہ ٹل جائے گا۔

شکار کے اس کھیل میں سب سے بڑا خطرہ کتوں کا تھی۔ بالی نے جو تدبیر سوچی تھی وہ بڑی لاجواب تھی اس طرح میرے فرار ہونے میں اور آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ میں رامو اور ڈاکٹر سے بھی غائب ہوا تھا اس لئے کہ میرے پاس چاقو اور پستول تھا۔ گپ اندھیرے میں امید کی کرن نظر آنے لگی تھی۔ ان دونوں خبیثوں کو اس دنیا سے نیست و نابود کرنا بے حد ضروری تھا۔

ناتشہ کی میز پر میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”رات شکار کا کھیل کیسا ہے؟“  
”وہ کھیل نہ تھا شکار نہ تھا بلکہ ایک جھوٹا مذاق تھا۔“ اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔

وہ ان کے کپڑے دھو تیں، کھانے پکاتیں اور اناج اور عمارتوں کے کمروں کی صفائی کرتی رہتی تھیں۔ ان میں سے کئی ایک فرار ہونے کی کوشش میں زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں تھیں۔

اس نے نہ تو مجھے بالائی منزل کے بارے میں بتایا اور نہ ہی اوپر لے گیا۔ بالی نے مجھ سے پھر کے وقت بتایا کہ بالائی منزل پر پہنچنے کی طرح بڑے بڑے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں لانچوں اور میزوں سے لونا ہوا مال رکھا جاتا ہے۔ پورچی خانہ اور سنور روم بھی ہے۔ اس عمارت کے عقب میں ایک اور عمارت ہے جس میں ایک جھوسا ہسپتال ہے۔ میں کب تک اس کے دفاتر میں بیٹھا اس کے ساتھ باتیں کرنا تھا۔ بچ کے بعد میں سونے کے لئے اپنے کمرے میں آ گیا۔ قیلو کہ کرنے کا بہانہ اس لئے کیا تھا کہ میں کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ یہاں جو بد نصیب لوگ قید تھے انہیں اس جہنم سے جلد از جلد نجات دلانا چاہتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شخص دنیا کے ذہین ترین لوگوں میں سے تھا مگر یہ شخص شیطان صفت نہ ہوا تا تو انسانیت کو بڑا فائدہ پہنچتا۔

☆-----☆

سہ پہر کے وقت بالی میرے کمرے میں آئی۔ میں نے کھڑکی میں سے ایک چھوٹی سی عمارت کی طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا کہ یہ کون سی عمارت ہے۔ اس نے بتایا کہ اس میں ایک پلانٹ لگا ہوا ہے۔ اس پلانٹ میں انسانی جسم سے نہ صرف کھال اتاری جاتی ہے بلکہ اسے ٹیکسیکل سے محفوظ بھی کر لیا جاتا ہے اس عمارت میں ٹیڑھی بھی ہے۔

شام کی چائے ہم چاروں نے مل کر پی۔ میں نے دھوس لیا کہ بیگم جمال کو بالی کا ساتھ دینا چاہئے پتا اور ڈاکٹر آدیس کا اس سے بار بار بات کرنا سخت ناگوار لگ رہا ہے۔ وہ شعلہ بار لگا ہوں سے بالی کو دیکھ رہی تھی۔ بالی اس کی نفرت اور غصے سے محفوظ ہو رہی تھی۔ اسے مزید جانے کے لئے وہ ڈاکٹر سے لگاؤ سے باتیں کرنے لگی تھی اور وارفتہ انداز سے دیکھ بھی رہی تھی۔ رات کے کھانے تک ہم چاروں تاش کھیلنے رہے۔

رات کے کھانے کے بعد ڈاکٹر، رامو کے ساتھ شکار کھیلنے کے لئے چلا گیا۔ آج دو بد نصیب آدمیوں کے ساتھ دو دونوں شکار کھیل رہے تھے۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا اور بالی کا انتظار کرنے لگا۔ پھر اس کے انتظار میں سو گیا۔ بالی نے رات تین بجے مجھے گہری نیند سے بیدار کیا۔ اس نے بتایا کہ رامو کوئی ایک گھنٹہ پہلے ہی آکر سویا ہے۔ اس نے مجھے ایک بے حد خوفناک قسم کا چاقو دیا جس کا پھل انتہائی زہریلا تھا۔ ایک نقشہ، پھل، تارچ، پستول

”اگر آپ کا یہ چیلنج ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”سونے کے کھلم میں قید رہنے سے بہتر ہے کہ آزادی کی موت نصیب ہو۔“

”ہم میں سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ کون فاتح ہو گا۔“ وہ بولا۔ ”اس لئے کہ آپ بھی شکاری ہیں اور میں بھی شکاری۔ آج ہم اپنی اپنی ساری ذہانت اور تجربے اس کھیل پر صرف کر دیں گے۔ شکار کا کھیل شلرنج کے کھیل کی طرح ہوتا ہے۔“

”شات مار پر کیا ہو گا؟ کیا آپ شرافت سے اپنی شکست تسلیم کر لیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ کھیل فرق کی موت پر ختم ہو گا چاہے اس میں دس دن کیوں نہ لگ جائیں۔“

”بالفرض محال میں اس کھیل سے فائدہ اٹھا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہوں تب آپ کیا کریں گے؟“

”ایسا ہونا ناممکن ہے۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”آج تک یہاں سے کوئی بچ کر گھٹنے نہ جانے گا۔ ایک مشتاق چوہہ دري ضرور نکل گیا تھا مگر وہ زندہ نہیں بچ سکا۔ آپ بھی امید رکھ کر اسے نکال دیں۔“

”آپ کی موت پر کیا ہو گا؟“

”میری موت کے بعد رامواس جزیرے کا مالک ہو گا۔ اتفاق سے وہ بھی مرجاتا ہے اور آپ اس جزیرے کے مالک ہوں گے۔“

”میری اولین کوشش یہ ہو گی کہ میں آپ کو اور رامواس کو اس دنیا سے جیت دے دوں اور وہاں اس کا رہنا ہو گا۔ آپ دونوں معذور اور اپالچ ہو جائیں اور ڈھاکہ شہر کے کسی گھر کے چار دیواریں پر لے جا کر ڈال دوں۔ ادھر سے جو شخص بھی گزرتا ہے وہ آپ دونوں کو اٹھائے اور جوتے مارے، آپ کے منہ پر تھوک کے پتلا ذلیل کر سکتا ہو کرے۔ جتنی اذیت دے سکتا ہو دے۔ یہی آپ کی سزا ہے۔“

میری یہ باتیں سننے کے بعد وہ ہنسنے لگا۔ بیکم جمال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد بولا۔ ”آپ کی ان نفرت انگیز باتوں سے میں مشتعل ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں اس شکار کے کھیل میں آپ کو اس بات کی اجازت دوں گا کہ آپ کوئی ایک ہتھیار اپنے ہاتھ لے سکتے ہیں مثلاً روپور، پستول، چاقو، چھریا بندوق..... اس کے علاوہ اس فخر دارک اور جوتے بھی پسند کے مل سکتے ہیں۔“

”مجھے ایک بھرا ہوا روپور اور دس چند رہ گویوں کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ دونوں آلو کے پتے تھے، وہ دونوں جنگل کے اندر داخل ہو کر ایک درخت کے پاس ڈر اور سہم کر بیٹھ گئے۔ شکار میں مزاحی نہیں آیا۔ ان دونوں نے میرا موڈ آف کر دیا۔“

”آپ نے ان کے ساتھ کیا کیا.....؟ کیا انہیں واپس لے جا کر زنداں میں ڈال دیا؟“

”راموس کے چاقو نے ان کا کام تمام بڑی آسانی سے کر دیا۔ وہ دو آدمی مل کر بھی راموس پر قابو نہ پاسکے۔“ وہ متحسرے بولا۔

”راموس کو دو کیا دس آدمی بھی قابو نہیں کر سکتے۔ وہ شیر بنگال ہے۔ شیر میرے ہے۔ فولادی آدمی ہے۔“ بیکم جمال درمیان میں بولی۔

”میں اپنا موڈ درست کرنے اور شکار کے کھیل کا لطف دوپالا کرنے کے لئے آج کی رات دنیا کا اور اپنی زندگی کا سب سے سنسنی خیز شکار کھیلوں گا۔ وہ ایسا شکار ہے کہ اس کے مقابلے کا شکار دنیا میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔ شکار کا مزہ اسی وقت آتا ہے جب شکاری میں جرأت، ذہانت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں چالاکی ہو۔ وہ بے حد بڑا بھی ہو اور اسے اپنی جان کی پروا نہ ہو۔“

”کیا ایسا شکار آپ کے پاس موجود ہے؟“ میں نے توں پر ٹھنک لگاتے ہوئے دریافت کیا۔

”جی ہاں ہے۔“ وہ معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ ”میری نظروں کے سامنے موجود ہے۔ آپ سے خطرناک شکار اور کون ہو سکتا ہے بھلا؟“

میرے بدن پر سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ ”تو آپ آج کی رات میرا شکار کھیلنا چاہتے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ وہ کہنے لگا۔ ”میں اصولی طور پر تین دن اسے اپنے شکار کو جو جانوروں کا شکاری ہوتا ہے اپنے پاس شاہی مسمان کی طرح رکھتا ہوں اور اس کی ہر طرح خاطر مدارات کرتا ہوں۔ میں اپنے آپ اس اصول کو توڑ رہا ہوں۔ آج ہی آپ سے شکار کا کھیل کھیلنا چاہتا ہوں۔ آپ بھی اس کھیل میں بہت لطف محسوس کریں گے اس لئے کہ دنیا کے دو بہترین ذہین اور بڑے شکاری ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آراء ہوں گے۔ آپ نے اپنی زندگی میں کبھی ایسا سنسنی خیز اور خطرناک شکار نہیں کھیلنا ہو گا۔ ایک طرف میں راموس دیر سے شکاری کہتے ہوں گے۔ دوسری طرف آپ ہوں گے..... آپ جو دس ذہین آدمیوں پر بھی بھاری ہیں۔“

اٹکے اٹھ کھٹے ہیں۔ وہ اس وقت کتھو سے مدد لیتا ہے جب کار کو تلاش کرنے میں وہ مہم ہوتا ہے۔

جنگل کے اندر جیسے جیسے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بڑھتا گیا وہ دیرے روشنی معدوم ہوئی مٹی اور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں گھپ اندھیرے میں کھڑا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بٹھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے جیب سے پنسل خارج نکالی اور اس کی روشنی کی مدد سے آگے بڑھنے لگا۔ چلتے چلتے مجھے شک سا ہوا تو میں نے رک کر زمین پر تارچ کی روشنی پینٹل کیوں کے جوئے ایسے تھے کہ ان کے مخصوص قسم کے نشانات نرم اور مکمل مٹی پر واضح اور صاف تھے۔ یعنی سیاہ تھی کہ وہ دونوں ان نشانات کی مدد سے میرا تعاقب کرتے ہوئے مجھے آئیں گے۔ یہ جوتے دے کر اس نے میرے ساتھ ایک طرح سے اربعہ کیا تھا۔

اس کہنے کے کہنے کے مطابق وہ چار گھنٹے کے بعد میری تلاش میں نکلے والا تھا۔ وہ کسی بھروسے کے قابل نہیں تھا اور چار گھنٹے کے بعد بھی میرے تعاقب میں آسکتا تھا۔ پھر میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ پھر میں نے یہ کیا کہ قدموں کے نشانات سے بھول بھلیاں سی پیدا کر دیں تاکہ وہ بے وقوفوں کی طرح نشانات سے پیچھے ہٹ کر ہٹا رہے۔ اس طرح مجھے وقت مل جاتا کہ میں دور نکل جاؤں۔ اس طرح کی بھول بھلیاں لومڑیاں پیدا کر دیتی تھیں۔ لومڑی سے زیادہ عیار اور ہالاک جانور نہ کھڑکی نہیں ہوتا ہے۔ وہ اچھے اچھے اور ہوشیار شکاریوں کو بھی بے وقوف بناتا ہے۔

اس جنگل میں پھولی بڑی اور خاصہ درخت راجھاڑی بہت ساری تھیں جس کی وجہ سے مجھے تیز چلنے اور مختلف راستوں میں پیچکر کھانے سے نہ صرف دشواری ہو رہی تھی بلکہ میرے ہاتھ اور چہرے پر ان کی رگوں سے خراب اشیں آتی تھیں اور میرے کپڑے بھی دواہیک جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ اگر میرے پاس پنسل تارچ نہ ہوتی تو میرے لئے راستے مل کرنا سخت دشواری ہوتا۔ ہر ایک میں نے اپنے دشمن کو الجھانے کا کام جاری رکھا۔ اس طرح مجھے تین گھنٹے گزر گئے۔ وہ ابھی تک میرا شکار نہ کرنے کے لئے یہاں نہیں آیا تھا اور نہ ہی مجھے کچھ اندازہ ہو سکا تھا کہ میں کتنی دور نکل آیا ہوں۔

ایک دوسری تدبیر میرے ذہن میں آئی۔ دشمن کو چالوں ہی سے بے وقوف بنانا یا ملتا تھا۔ میری ذہانت اور تجربے کا اصل امتحان تو اب تھا۔ میں ایک درخت کے پاس پہنچا تو بہت بڑھا ہوا تھا اور مضبوط بھی تھا۔ اس کی گھنی شاخیں دوسرے درخت کی شاخوں سے

”ایک غالی جو ڈا چاہئے جو شکاری بننے ہیں۔ جو تے ایسے چاہئیں جو کیٹوں کے ہوں نہ سے نشان اٹتے مدھم پڑیں کہ نظریہ آئیں۔ اس سے آواز بھی پیدا نہ ہو۔ خوراک میں پنہ، ہنریت، ابلے ہوئے انڈے، کھن، اور تازہ پاؤرونی (ڈبل روٹی) ہو۔ ایک تھیلا بھی چاہئے۔ قمر میں میں چاہئے بھی مل جائے تو اچھا ہے۔“

”آپ شکار کے کھیل پر جارہے ہیں یا جنگل پر.....؟“ بیگم جمال نے پوچھا۔

”آپ اسے کچھ بھی سمجھ لیں.....“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ کھیل ایک دن ا نہیں ہے۔ معلوم نہیں کتنے دن تک جاری رہے؟“

”میں آپ کو اس کھیل میں ایک رعایت دے رہا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”آپ سر پہرے وقت یہاں سے نکل کر جنگل کی طرف جائیں گے۔ میں ٹھیک آٹھ بجے یہاں سے روانہ ہوں گا۔ آپ اس موقع سے متناقدہ اٹھاسکتے ہیں اٹھالیں۔“

سر پہرے وقت بالی نے ایک غالی لباس اور کیٹوں کے جوئے لاکر دیئے کہ میں انہیں چن کر اس کے ساتھ ڈاکٹر کے کمرے چلوں۔ میں نے لباس تبدیل کرنے اور جوئے پہننے کے بعد بالی کا پتول، پنسل تارچ، نقش اور چاقو اپنے لباس میں چھپالے۔ بالی بہت خوفزدہ اور پریشان ہو رہی تھی اور میری کاسیالی کے لئے دعا بھی کر رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ وہ خدا پر بھروسہ رکھے اس نے چاہا تو آج ہی یہ کھیل ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔

میں بالی کے ساتھ کمرے میں پہنچا تو وہاں بیگم جمال، رامو اور ڈاکٹر موجود تھا۔ میز پر امراطلوبہ سامان رکھا تھا۔ تھیلے میں کھانے کا سامان تھا۔ میں نے رپو اور دیکھا وہ بھرا ہوا تھا۔ میں گولیاں الگ سے تھیں۔ پھر میں ڈاکٹر سے الوداعی مصافحہ کر کے رخصت ہوا۔ رامو مجھے اپنے ساتھ لے کر جنگل کے پاس پہنچا۔ وہ اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک کہ میں اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

بالی نے مجھے اس جنگل کے بارے میں مختصر طور پر کچھ معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ اگر نے بتایا تھا کہ اس جنگل کے اندر دو تین جگہوں پر دلدلیں ہیں۔ وہ بد نصیب آدمی اگر دلدلوں کی نذر ہو چکے ہیں۔ انہیں رامو موت کی دلدل کہتا ہے۔ اس کے علاوہ دو تین جگہ پر گلیاں بنی ہوئی ہیں جو اس بات کی نشانی ہیں کہ دریا کا کنارہ قریب ہی ہے۔ ان میں سے کسی ایک گلیاں کوئی نہ کوئی مسلح آدمی یا رامو ضرور موجود ہوتا ہے تاکہ شکار کا خاتمہ کیا سکے۔ رامو شکاری کو پتول کی گولی کے بجائے چاقو چھرے سے قتل کرنا پسند کرتا ہے۔ شکار



دھن کی میری موجودگی کی خبر دے دی تھی۔ میں نے مارچ آف کر کے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ہیرے ہاتھ میں وہ خوفناک شکاری چاقو آکھیا جو ابلی نے مجھے دیا تھا اور جس کا پھل زہر میں بجا ہوا تھا۔ میں نے تھملا دیاں چھوڑا اور ایک ہنگلے سے کھڑا ہو گیا۔ ایک قریبی درخت کے پاس کھڑے بائیں ہاتھ میں مارچ اور دائیں ہاتھ میں چاقو کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

میں نے اپنے کان اس طرف لگا دیئے تھے جس طرف سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی مادی ہو چکی تھیں۔ میں نے درخت کے تنے کی آڑ سے جھانکا اور اپنی سانس روک لی اس لئے کہ آوازیں بہت قریب سے سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ چیز جھاڑیوں میں سے راستہ بناتی ہوئی لگی اور مجھ سے دو قدم پر سے گزری تو ہیرے سارے بدن پر لرزہ ساخاری ہو گیا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ بچان بھی لیا تھا۔ یہ ملعون رام تھا۔ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح رینگتا ہوا آیا تھا اور اس کے منہ میں ایک خوفناک چاقو دبایا تھا۔

وہ دو قدم آگے چل کر رک گیا۔ وہ کسی جانور کی طرح زمین کو سوجھنے اور دیکھنے لگا۔ شاید اس کے منتوں میں کھانے کی خوشبو پہنچ گئی تھی اور اس خوشبو نے اسے میری موجودگی کا احساس دلادیا تھا۔ وہ ایک دم سے سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

دوسرے لمحے اس کے ہاتھ میں چاقو پھل رہا تھا وہ تیزی سے چاروں طرف گھوم کر مجھے متلاشی نظروں سے دیکھنے لگا اندھیرے میں اس کا چہرہ بد صورت اور خوفناک لگ رہا تھا اور اس کی بڑی بڑی لال لال آنکھیں کسی شکاری کتے کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ کسی درندے کی طرح انسانی خون کا پیاسا ہو رہا تھا اور اس کے حلق سے کتے کی سی غراہٹ نکل رہی تھی۔

میرے لئے اسے قتل کر دینا چنداں مشکل نہیں تھا میری جیب میں بھرا ہوا پستول موجود تھا میں اس پستول سے اسے بڑی آسانی سے شوٹ کر سکتا تھا مگر یہ سراسر بڑلی تھی اور ایک مرد کی شان کے خلاف تھا۔ میں اس طرح اپنی مراد لگی کی تو بین کرنا نہیں چاہتا تھا اور مجھے خون خرابا بھی پسند نہ تھا میری یہ خواہش تھی کہ وہ میری تلاش میں آگے بڑھ جائے اور میں اپنا راستہ لوں۔

اس کی نظر ہیرے بیگ پڑی تو وہ اس طرف تیزی سے لپکا اس بیگ میں پستول کھانے کی چیزوں کے علاوہ نقشہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اب اس سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا کہ میں اسے لگا دوں اور ایک اٹھانے نہ دوں۔ اس کے بیگ اٹھانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ پستول

بایم لی ہوئی تھیں۔ مجھے اب نازن کی طرح ایک درخت سے دوسرے درخت پر جانا تھا یہ کام ذرا مشکل تھا مگر ناممکن نہیں۔

میں نے قیلے کو گلے میں لٹکا اور درخت پر چڑھتے وقت اس بات کا خیال رکھا کہ اگر پر میرے جو تان نشان نہ آئے پائے۔ میں درخت پر چڑھ گیا۔ اس کی شاخوں کی مدد سے دوسرے درخت کی شاخوں کو پکڑ کے اس پر جانے میں میں منٹ لگ گئے۔ جب میں تیرے اوپر دوڑتے درخت کو سر کیا تو اس میں پورے بیس منٹ بھی نہیں لگے تھے۔

پانچویں درخت پر بیٹھ کر میں سستانے لگا۔ مجھے دراصل کسی ایک کی تلاش تھی۔ مجھے شکار کے کھیل سے زیادہ دیر لگنے کا رے سے دلچسپی تھی۔ میں ساحل پر پہنچ کر دیر پائیر تیرتا ہوا کسی گاؤں کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں تیر کے گاؤں تک پہنچنا میرے لئے آسان تھا اور میں چھ سات گھنٹے تک بڑی آسانی سے تیر بھی سکتا تھا۔ اندھیرے میں تیرنے سے کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑ سکتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے درخت سے اتر کر اپنا سفر جاری رکھا۔ میں بڑے عمامہ انداز سے قدم اٹھاتا ہوا چل رہا تھا اور اس بات کی کوشش بھی کر رہا تھا کہ میرے قدموں کی آوازیں بلند نہ ہوں۔ میں چلتے چلتے ایک جگہ رک گیا۔ اس جگہ پر ایک تالاب تھا۔ میرے پاس مارچ نہ ہوئی تو میں اب تک اس تالاب کے اندر اتر جاتا۔ اس تالاب کی سطح پر سکون سی تھی۔

مجھے اس وقت بڑے زور کی ہموک لگ رہی تھی۔ میں نے مارچ کی روشنی میں تالاب کے پاس ایک جگہ صاف کی اور وہاں بیٹھ کر میں نے سلائی پر کھن لگا کر بنزیمٹ نکالا۔ پھر میں نے ڈبل ڈیکر سینڈویچ جاپا اور کھانے لگا۔ چاروں طرف گھبراتا نہ پایا ہوا تھا۔ آس پاس ہینگر اور کڑوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دور کبیں پر ندے پہنچا ہوا رہا تھا۔ چاروں طرف فضا میں وحشت سی چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کس سمت چلنا چاہیے۔ دور درت دور روشنی دکھائی دے رہی تھی جو درختوں سے چھن رہی تھی۔ پانچویں تاریخ کے چاند کی چاندنی تھی جو سبہ حد زرد اور پھلکی پھلکی سی تھی۔

میں نے تھرموس سے نکال کر چائے پی تو بدن میں توانائی سی آگئی اور میں تازہ دم ہو گیا۔ میں قیلے میں سامان رکھ رہا تھا کہ میرے سارے بدن اور انگلیوں کے پوروں میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے ایک آہٹ سی سنی گوئی اور اٹھا۔ مارچ کی روشنی نے میرے





کو حرکت تک نہیں دے سکتا تھا اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور چہرہ سفید پڑا چلا گیا تھا۔ چوکی کے پاس ایک صاف ستھری پلاسٹک کی بائلی رکھی تھی۔ ڈاکٹر ایک کونے میں کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھارد والا پھرا تھا۔ اس نے چہرے کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد پلڑا ایک طرف پھینک دیا اور چوکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اس کا چہرہ ایک انسان کا چہرہ نہ تھا ایک وحشی درندے کا تھا جو انتہائی ہمایک اور مکروہ تھا۔ چہرے پر سٹاکی تھی اور آنکھوں میں سے درندگی جھانک رہی تھی وہ اس لڑکے کو گھور رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک کو دیکھ رہی تھی۔

”تم..... تم..... کیا کرنا چاہتے ہو۔“ لڑکے نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

”میں.....؟ میں تمہیں ذبح کر کے تمہارا خون پینا چاہتا ہوں۔“ اس کے ہونٹوں پر انتہائی مکروہ مسکراہٹ چمیل گئی۔ ”میں نے سنا ہے کہ انسانی خون آب حیات لئے کم نہیں ہوتا۔ میں تمہارا خون پی کر تجربہ کرنا چاہتا ہوں پھر تمہارا گوشت بھون کر کھا جاؤں گا.....“

”نہیں..... نہیں.....“ وہ بیانی انداز سے چچاس کی حالت میں بیانی مریض کی سی ہونے لگی۔ ”میں نے کیا کیا ہے۔ میں نے تمہارا کیا کیا ڈاڑھے، مجھے چھوڑ دو، مجھے معاف کر دو۔“ وہ گڑگڑا لگا۔

”معاف کر دو؟“ وہ استہزائی انداز سے ہنسا۔ ”معافی کا لفظ بھری لغت میں نہیں ہے نہ میں کسی کو معاف کرنے کا قائل ہوں اور نہ میں معافی کو مردانگی سمجھتا ہوں۔ معافی صرف بزدل مانگتے ہیں تم کس بات کی معافی مانگ رہے ہو؟“

”میں..... میں تم سے رحم کی التجا کر رہا ہوں..... میں انسان ہوں ذبح انسانوں کو نہیں کیا جاتا ہے۔ تم کیسے انسان ہو جو ایک انسان کو ذبح کرنا چاہتے ہو؟ خدا کے طرف سے ڈرو.....“

”جب انسانوں کو گولی یا چاقو چہرے سے قتل کیا جاسکتا ہے تو اسے ذبح کیوں نہیں کیا جاسکتا؟ قتل کرنا اور ذبح کرنا ایک ہی بات ہے۔ میں نے قتل تو بہت کئے ہیں۔ کسی انسان کو انجانے کا یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔ تم بڑے اچھے موقع پر ہاتھ لگے۔“

”پلیزز..... پلیزز.....“ وہ رونے لگا۔ ”خدا کے لئے..... میرے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے میرے ماں باپ، بھائی، بہن، میرے غم میں مر جائیں

بڑا اور اصل خطرہ ڈاکٹر کی صورت میں موجود تھا اور اس خطرے پر قابو پانا سب سے بڑی بہادری تھی اور کمال تھا۔ میری یہ دلی خواہش تھی کہ میں اس شیطان کو ہر قیمت پر کیفر کردار تک پہنچاؤں۔

اس بات کا امکان تھا کہ وہ شیطان میرے آس پاس ہی کہیں موجود ہے اور کسی بھی لمحے مجھے اپنا نشانہ بنا سکتا ہے۔ وہ اب تک میرے سامنے یا مقابلے پر اس نے نہیں آیا تھا کہ مجھ پر نفسیاتی حربے آزماتا چاہتا تھا کہ میں اس کے خوف سے بھاگتا ہوں۔ وہ مجھے ہراساں اور پریشان کر کے لطف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک شکاری کو شکار بنا کر اسے موت کے منہ میں پہنچانا چاہتا تھا۔

میری اپنی غایت اس میں تھی کہ میں چلا رہوں میرا یہاں ٹھہرا میرے لئے کسی بھی صورت میں مناسب نہیں تھا۔ یوں بھی ایک خطرہ سامنے لا محسوس ہو رہا تھا۔ میں مخالف سمت چل پڑا تو زوری ور چلنے کے بعد مخالف سمت کسی قدر دو فاصلے پر درختوں کے بیچ سے پھینکی سی چاندنی جھانکتی نظر آ رہی تھی میں نے اپنا رخ اس طرف کر لیا۔

میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا بڑھنے لگا میں نے اپنی تاریخ بھی روشن نہیں کی اس لئے کہ ڈاکٹر کو میری موجودگی کا پتا چل سکتا تھا۔ میں ان درختوں سے قریب ہوتا جا رہا تھا کہ ایک چنچ سی سی ہر انسانی پنج تھی جو فضا میں بلند ہوئی یہ کسی نوجوان لڑکے کی پنج تھی۔ میں اس پنج کی آواز کی سمت بڑھا تو تیرے ذہن میں کئی سوالات کیڑوں کی طرح کلپانے لگے کہ یہ لڑکا کون ہے؟ جنگل میں کہاں سے آگیا؟ وہ کس لئے پنج رہا ہے۔ میں سوچ ہی رہا تھا جنگل کی خاموش فضا اس کی دہشت ناک چیخوں سے گونجنے لگی۔

میں نے اپنی رفتار تیز کر دی چند لمحوں کے بعد میں ان درختوں کے پاس پہنچ گیا جہاں چاند کی روشنی چھن رہی تھی۔ ان درختوں کے بیچ ایک بہت بڑی جگہ کھلی ہوئی سی تھی ایک بہت ہی چھوٹا سا میدان تھا اس کی زمین ہموار اور صاف تھی اس جگہ ایک کنیاسی بنی ہوئی تھی۔ اس کنیاسے اندر سے اس لڑکے کے چپنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے ازیت دی جا رہی ہو۔

میں دے پاؤں اور بے آواز لٹکیا کے پاس پہنچا اس کی چٹائی کی دیوار میں بہت سارے روزن نظر آ رہے تھے۔ میں نے ایک روزن سے اندر جھانکا اس کے اندر ایک چوکی تھی۔ طاق پر ایک بڑی سی لائٹن روشن تھی۔ میں نے اس کی روشنی دیکھا۔ ایک سترہ اٹھارہ برس کا نوجوان اور خوبصورت سالاکار سیوں سے اس طرح بندھا ہوا تھا کہ وہ اپنے آپ

گے..... پلیز....."

"خدا.....؟" اس کے لیے میں زہر بھر گیا۔ "تم کس خدا کا واسطہ دے رہے ہو؟ اس خدا کا جو کسی کی سنتا نہیں ہے جس کا وجود ہی نہیں ہے۔ اگر اس کا وجود ہے بھی تو وہ اتنا بے بس ہے کہ کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔"

"بچاؤ..... بچاؤ....." لڑکا پوری طاقت سے چیخنے لگا۔ مجھے بچاؤ....."

"چیخو نہیں....." اس نے آگے بڑھ کے لڑکے کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ "میاں کوئی بھی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ تمہاری وجہ سے مجھے شکار پر جانے کے لئے دیر ہو رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا شکار ہاتھ سے نکل جائے۔"

وہ لڑکے کو ذبح کرنے کے لئے اس پر بھگا اور اسے سیدھا کرنے لگا تو میں تیزی سے دروازے کی طرف پلکا اور ہسپتال ہاتھ میں لیا۔ اتفاق سے دروازہ کھلا ہوا نہیں تھا فضا میں لڑکے کی ہولناک چیخیں گونج رہی تھیں۔ میں دروازے کو دھک دیتے ہوئے اندر داخل ہوا اس نے لڑکے کو چوکی پر قربانی کے جانور کی طرح لٹا کر اس کے سینے پر اپنا گھٹنا رکھا ہوا تھا اور اس کے سر کے مین نیچے پائٹی رکھی ہوئی تھی تاکہ خون اس میں گرے۔ وہ اس کی گردن پر چھرا پھیرنے والا تھا۔ اس نے جو میری آوازیں سنیں تو اپنا ہاتھ روک کر چونک کے میری طرف دیکھا۔ اگر مجھ سے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اس معصوم لڑکے کے گلے پر چھرا چل چکا ہوتا۔ اس نے بغیر کسی تاخیر کے مجھ پر چھرا دے مارا۔

اگر میں ایک طرف تیزی سے ہٹ نہ ہوتا تو وہ چھرا میرے سینے میں اتر جاتا۔ اس کیلئے کا نشانہ بڑے غضب کا تھا، میری زندگی باقی تھی جو میں اس حملے کی زد میں نہیں آسکا۔ اس نے اپنا نشانہ خطا ہوتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہی جیب میں ہاتھ ڈالا میں کوئٹا بن کر اس کے سر پر پھینک گیا۔ "ڈاکٹر! اب تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔" میں نے اس کی کتبی پر اپنے ہسپتال کی نال رکھ دی۔ "اپنا ہسپتال میرے حوالے کر دو..... تم نے پس دینا کیا تو میں تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کرنے میں ذرا بھی تاہل نہیں کروں گا۔"

اس نے بڑی خاموشی سے اپنی جیب سے ہسپتال نکال کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "مشرسار! ارہا تمہاری یہ عارضی کامیابی ہے۔"

اس نے میرے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی ہٹ و صل نہیں کیا اور ردیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی اس میں ایک "بوا" چابیوں کا گچھا اور

شکاری چاقو تھا اسے میں نے اپنے حیلے میں ڈال لیا پھر میں اسے ہسپتال کے نشانے کی زد میں لیتا اور اس پر کڑی نظر رکھے ہوئے پیچھے ہٹا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر زمین پر پڑے ہوئے چھرے کو اٹھا کر چوکی کی طرف بڑھا۔ چھرے سے لڑکے کے جسم پر بندھی ہوئی رسیوں کو کاٹ دیا۔

اس لڑکے کو کوئی زندگی ملی تھی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اس نے چوکی سے اتر کے میرے پاس آکر مومنیت بھرے لیے میں کہا۔ "سر! آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے....." میں نے درمیان میں پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"اقبال بیک....." اس نے جواب دیا۔

"اقبال بیک یہ باتوں کا وقت نہیں ہے۔ تم جلدی سے یہ رسی اٹھاؤ اور اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے انہیں مضبوطی سے باندھ دو....."

اقبال بیک نے فوراً ہی میری ہدایت پر عمل کیا جب وہ اس کے ہاتھ باندھ چکا تو میں نے بھی چیک کیا اس نے بڑی مضبوطی سے رسی میں اس کے ہاتھ جکڑ دیئے تھے پھر میں نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کے اسے چوکی پر بٹھادیا۔ اس کا پیٹ چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ "ڈاکٹر! اب تم کیا کہتے ہو؟ اگر ہم تین ختم ذبح کر دیں تو کیسا رہے گا؟"

"تم جو چاہے کر سکتے ہو۔" وہ سیٹ لہجے میں بولا۔ "میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں میں تم سے رحم کی بیک نہیں مانگوں گا۔"

"مجھے اس شکار کے کھیل میں ذرا بھی لطف نہیں آیا ڈاکٹر! میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ہوں۔" تم نے صرف بہت جلدی میرے ہتھے چڑھ گئے بلکہ آسانی سے شکست بھی کھا گئے..... اس کھیل میں مجھے کسی قسم کی سستی خیزی بھی محسوس نہیں ہوئی۔ "اس لڑکے اور خون کے تجربے کے چکر میں پڑ کر میں نے اپنے ہیروں پر کھلاڑی مار لی۔" اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ "درد صورت حال اس کے برعکس ہوتی..... مجھے میری بے پروائی کی سزا ملی ہے۔"

"آج ابھی اور اسی وقت تمہارا انسانیت سوز درد ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔ تم ہازی ہار گئے....."

"مہرمد اور ختم ہوا ہے اور نہ ہی میں بازی ہار ہوں۔" وہ بڑے یقین اور اعتماد کے لہجے میں کہنے لگا۔ "تم کچھ لیتا میرا دامو تمہاری اس جیتی ہوئی بازی کو الٹ کر رکھ دے

درختوں کے بیچ میں تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ راستہ دریا کی طرف جاتا ہے اور دریا نصف میل پر ہے۔ وہاں اس کی اور ڈاکٹر کی مونرو بوش بھی موجود ہیں اور ہم اس میں سوار ہو کر فرار ہو سکتے ہیں۔ میں نے اسے مختصر طور پر بتایا کہ اس راستے اور مونرو بوش میں جانے سے کس قسم کے خطرات پیش آ سکتے ہیں۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ اس راستے سے واپس کیوں اور کس لئے جانا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر آگے آگے قربانی کے کسی جانور کی طرح چل رہا تھا۔ ہم دونوں اس سے تین چار قدم پیچھے تھے۔ لائین کی روشنی اندھیرے میں راستہ دکھائی تھی۔ چلتے چلتے اقبال نے مختصر طور پر اپنے بارے میں بتایا کہ وہ چاند پور شہر میں رہتا ہے اور اس کے گھر والے پان کا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ کل راشی نامی مونرو بوش میں اپنی بہن کے سرال جانے کے لئے نکلا جو ایک گاؤں میں رہتی ہے۔ بد قسمتی سے وہ راستہ بھول گیا اور بھٹک کر اوجھر آ نکلا۔ یہاں پہنچ کر اس نے سوچا کہ رات بھر دریا میں بھٹکنے سے تو بہتر ہے کہ کنارے آرام کر لیا جائے اور صبح ہوتے ہی نکل جائے۔ اتفاق سے اسی وقت ڈاکٹر کی مونرو بوش ادھر آ نکلی اور ڈاکٹر نے اسے دیکھا تو اسے اپنے پتوں کے نشانے کی زد میں لیا اور ساتھ کھینالے کر پچھلے پھر اس کے سر پر ایک ڈنڈے کی ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دیا جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے اپنے آپ کو رسیوں میں جکڑ پایا۔ اس نے اپنے آپ کو بے دست دیا پھر چٹنا چٹنا نادر ہد کے لئے کپڑا شروع کر دیا۔ وہ اسے ذبح کر کے اس کا خون چٹنا چٹنا تھا کہ میں نجات دہندہ بن کر پہنچ گیا۔ مجھ سے اگر ایک پل کی بھی تاخیر ہو جاتی تو وہ ذبح ہو چکا ہوتا۔

تلااب پر پہنچ کر میں نے ڈاکٹر کو رامو کی ہڈیوں کا ڈھانچا دکھایا جو قدرت کے بھیانک انتقام کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ میں نے اسے بتایا بھی کہ کس طرح سے تلااب کی آدم خور مچھلیوں نے رامو کو کیٹھن ہی کیٹھن چٹ کر لیا۔ اس ثبوت کے باوجود اسے میری بات کا یقین نہیں آیا۔ اس کے خیال میں یہ کسی مفرد شکاری کی لاش کا ڈھانچا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اس پر نفسیاتی اثر ڈالنے کے لئے جھوٹ بول رہا ہوں۔ اس کے خیال میں رامو لہندہ تھا اور راستے میں اس سے کسی گندہ بھیڑ ہو سکتی تھی۔

میرے دل کے کسی کو نے میں یکبارگی یہ خیال آیا کہ اس مرود شیطان کو اس تلااب میں دھکا دے دوں۔ اس غیبت کے لئے اس سے بڑی سزا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ پھر میں نے کچھ سوچ کر اپنا ارادہ بدلتی کر دیا اور تلااب کے پاس سے کوچ کیا۔ ہم تینوں ایک قافلے کی صورت میں رکے بغیر چلتے رہے۔ صرف ایک جگہ تھوڑی دیر کے لئے رک کر ناشتہ کیا

گاہ۔ تم رامو کو نہیں جانتے سالار! یہ صرف میں جانتا ہوں کہ وہ کیسا خطرناک ذہین اور چالاک شخص ہے۔ اس میں کتنی صلاحیتیں ہیں اس کے علاوہ وہ ایک بہترین شکاری بھی ہے۔ تھوڑی دیر کی بات ہے وہ تمہارا اس عارضی فتح کو پل بھر میں خاک میں ملا کر رکھ دے گا..... صبح کے ناشتے میں ہم تمہارا اور اس لڑکے کا گوشت بھون کر کھا رہے ہوں گے۔“

اس کی بات سن کر اقبال کا چہرہ رفتی ہو گیا۔ وہ مجھ سے خوفزدہ سمجھے میں بولا۔ ”آپ اس موذی کو گوئی کیوں نہیں ماردیتے..... یہ شیطان زندہ رہنے کے قائل نہیں ہے..... یہ رامو کون ہے؟“ اس کے سینے میں سانسوں کا کھلٹا پیدا ہو گیا تھا۔

”تم فکر نہ کرو یہ ہمارا بال تک بھیانک کر سکتا۔“ میں نے اقبال کو دلاسا دیا پھر اس سے مخاطب ہوا۔ ”تم جس رامو پر اتنا بھروسہ اور ناز کر رہے ہو وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ قدرت نے اس ذلیل اور غیبت سے ایسا بھیانک انتقام لیا ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کاش! قدرت تم سے اس سے کہیں زیادہ خوفناک انتقام لے.....“

”تم جھوٹ بول رہے ہو تاکہ میں رامو کی موت کی خبر سن کر خوفزدہ پریشان اور غمگین ہو جاؤں“ اپنا حوصلہ بارود اس دنیا میں آج تک اس سے انتقام لینے والا پیدا نہیں ہوا نہ تمہارا خدا میں اتنی قدرت ہے کہ اسے سزا دے سکے۔“

”تم زبان بکتے لگے۔“ مجھے اس کے غرور و تکبر پر سخت طیش آ گیا۔ ”میں تمہیں اس جگہ لے جا رہا ہوں جہاں وہ قدرت کے عبرتناک انتقام کا نشانہ بنا ہے۔ پھر تمہیں یقین آ جائے گا کہ خدا خالوں سے کیسا بھیانک انتقام لیتا ہے۔“

میرے کہنے پر اقبال نے جلتی ہوئی لائین اٹھالی۔ میں نے محظ باعقد کے طور پر اسے ڈاکٹر کا پتول دے دیا اور اسے ڈاکٹر پر کڑی نظر رکھنے کی ہدایت کی۔ اس لئے کہ وہ ایک شاطر آدمی تھا اور اس نے اپنے آدمی جنگل میں چھپا رکھے ہوں گے وہ اس کی ایک آواز پر اس کی مدد کے لئے آ سکتے تھے۔ اقبال سخت مشتعل اور ہڈیاں پانی ہو رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کو قتل کرنے کے ورپے ہو رہا تھا میں نے اسے بڑی مشکل سے قابو میں کیا اور اسے اس بات پر قائل کیا کہ ہمیں قانون کو ہاتھ میں لینا نہیں چاہیے اس کے جرم کی سزا اسے قانون دے گا۔ اقبال کا کہنا تھا کہ اسے وہ سزا نہیں ملے گی جس کا یہ مستحق ہے۔ میں نے اپنا پتول اپنے ہاتھ میں رکھا اور اسے نشانے کی زد میں لے لیا۔

جب ہم تینوں کھینالے باہر آئے تو اقبال نے اس راستے کی طرف اشارہ کیا جو دو



اور چائے پی تھی۔ ڈاکٹر نے کھانے سے صاف انکار کر دیا تھا اس نے صرف چائے پی تھی۔ اس نے راستے میں ایسی کوئی حرکت نہیں کی جس کی وجہ سے ہمیں کوئی پریشانی اٹھانی پڑی ہو۔ وہ تو خوش خوش چل رہا تھا جیسے اس کی رہائش گاہ پر پہنچنے کے بعد رامو اور اس کے ساتھی اسے چھڑا لیں گے۔

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم مجھے میری رہائش گاہ پر لے جانے کے بعد جج جاؤ گے؟ میرے ساتھی تھیں بتائیں گے نہیں..... تم دونوں کی بہتری اس میں ہے کہ فرار ہونے کی کوشش کرو۔“

”یہ تمہارا خیال خام ہے ڈاکٹر!“ میں نے اس سے ہنکار دی۔ ”تمہارے سینکڑوں ساتھی بھی میرے منصوبے کو ناکام نہیں بنا سکتے ہیں.....“

وہ میری خیر انداز سے مسکرا دیا۔ ”اپنے دل کی حسرت بھی پوری کر کے دیکھ لو۔“

ہم دونوں نے بہت دیر سے کوئی بات نہیں کی صرف سوچتے اور چلتے رہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے احساسات اور خیالات کو پڑھ رہے تھے۔ ہم دونوں کی سوچ دو مختلف راستوں کی طرح الگ تھی۔ ہم متنازع اور مختلف سمتوں میں سوچ رہے تھے۔ میرے ذہن میں جو منصوبہ تھا میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کے پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔ ڈاکٹر چونکہ اس وقت میرے رحم و کرم پر اور قید میں تھا اس لئے بڑی آسانی سے اس کے ساتھیوں اور جزیروں پر قابو پایا جاسکتا تھا۔ اس کے آدمیوں پر قابو پانے کے لئے ان لوگوں سے مدد لی جاسکتی تھی جو اس کی قید میں تھے۔ یہ سنہری موقع ملا تھا اور میں اسے کسی قیمت پر ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتا تھا۔

اگر اس کے چہرے پر ایک عجیب سی دھک اور آنکھوں میں چمک تھی۔ نہ جانے اس کے ذہن میں کیا منصوبہ تھا جس کی وجہ سے وہ پرامید اور خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ وہ اپنی رہائش گاہ پر پہنچ کر اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس جیتی ہوئی بازی کو اٹ کر رکھ دے گا۔ کامیابی اس کے قدم چومے گی اور وہ فاتح رہے گا۔

جب ہم اس گئے اور تاریک جنگل سے نکل کر کھلی جگہ پر آئے تو سہانی صبح نے استقبال کیا۔ چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا میں خشکی تھی۔ تروتازہ ہوا کے جھونکوں نے بدن میں تازگی بھری تھی اور محسوس کا احساس مٹ گیا تھا۔ جنگل کا راستہ اس رہائش گاہ کی عمارت کے عقب میں تھا۔ میں نے اقبال کو پوسلے سے بتا دیا تھا کہ اسے ہو شیار اور چوکس رہنا ہو گا۔ یہاں چھپے ہوئے اور درندہ صفت بد معاشوں سے واسطہ پڑے گا۔ اقبال

ایک نوجوان لڑکا تھا لیکن تھا وہ بڑا بچا اور بڑا۔ وہ ذرا بھی ہراساں اور خوفزدہ نہ تھا۔ اس کے حوصلے بہت بلند تھے۔ اس کی بہت دیکھ کر مجھے اس پر رشک آنے لگا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ جو ڈروا کر لے بھی جاتا ہے اور اس کے پاس بلیک ہیلز ہے۔

جس وقت ہم اس کی عظیم الشان عمارت کے اگلے حصے کی طرف بڑھ رہے تھے فضا میں بہت سارے لوگوں کا شور مچا دیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے زبردست جشن منایا جا رہا ہو اور لوگ خوشی سے دیوانے ہو رہے ہوں۔ یہ کس بات کی خوشی اور جشن ہے، میری سمجھ میں نہیں آیا اور نہ ہی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوا چاہتا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ یہ جشن بد معاشوں کا ہے ہوں۔ شاید انہوں نے ایسی کوئی لالچ یا شیر پکڑا ہو جس میں بہت سارا مال نعمت اور لڑکیاں ہاتھ میں گئی ہوں۔ شاید اس وجہ سے وہ خوشی سے پاگل ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر بھی عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو رہا تھا۔ وہ دوخمی بڑا حیران اور خوش ہو رہا تھا۔ میں عمارت کی طرف بڑھتے ہوئے چاروں طرف دیکھتا جا رہا تھا کہ کیسے اس کے آدمی تو اس طرف نہیں آ رہے۔ پھر میں جھانپوں کے پاس پہنچ کر رک گیا اور اسے بھی روک لیا۔ اس کے سامنے آکر میں نے پتول کی نال اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھتے ہوئے تہہ لبے میں کہا۔ ”سنو ڈاکٹر! اگر تم نے اپنے ساتھیوں کے سامنے پہنچ کر میرے کبھی بھی حکم کی خلاف ورزی کی تو میں تمہیں بلا درلج گولی بار دوں گا، تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے تو میرا ہر حکم ماننا ہو گا۔“

ڈاکٹر نے میری بات کا جواب نہیں دیا بلکہ معنی خیر انداز سے مسکونہ لگے۔ یہ لمحوں اس بات سے خوش ہو رہا تھا کہ اس کے آدمی ہم دونوں کو کسی نہ کسی طرح قابو کر لیں گے۔ ہمیں شہادت ہو جائے گی۔ ہم موت کے گھاٹ اتار دیئے جائیں گے۔ اس کی مکروہ مسکراہٹ نے میری جان جلادی۔ میں نے تھیلے میں سے چھرا نکال کر اقبال کے ہاتھ میں تھما دیا اور اسے بتایا کہ اس سے اسے کیا کام لینا ہے۔

ہم آگے کی طرف بڑھ رہے تھے تو یہ مردود ہمارے نرے میں اس طرح سے تھا کہ اقبال نے اس کی پشت پر چھرے کی نوک رکھی ہوئی تھی اور میرے پتول کی نال اس کی ٹھوڑی میں اس طرح سے دھکی ہوئی تھی کہ اسے درد کی وجہ سے اپنی گردن اونچی کر کے چٹا پڑ رہا تھا۔ میری انگلی لبیں پر تھی۔ اس کے چہرے کی دھک اور آنکھوں کی چمک کا درد و در تک پتا نہیں تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑا چلا گیا تھا جیسے اسے اپنی نظموں کے سامنے موت کے فرشتے کھڑے نظر آ رہے ہوں۔



ہے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ حالات پر پوری طرح قابو پانے کے بعد چاند پور پولیس کو بلانے پر تمام واقعات کے بارے میں بتا دیا گیا۔ چاند پور اس جزیرے کے قریب تھا۔ پولیس دوشنبہ کے ساتھ دوپہر تک یہاں پہنچنے والی تھی تاکہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔ پولیس اور شہریوں کے پہنچنے سے پہلے پہلے ہم نے اس شیطان مردود کی ساری دولت جو اس کی تجوری میں بند تھی ان بد نصیب لوگوں میں مساویانہ طور پر تقسیم کر دی۔ اس تجوری میں تین کروڑ ڈاکھانہ رقم کی مددات میں تھے۔

ہالی نے ہمارے پاس پہنچ کر ڈاکٹر کو شہر بلانے کا کہا۔ دیکھا اور اقبال کے ہاتھ سے مہراجپت کر اس کے چہرہ کو چھو جانتی تھی کہ کیپٹن نے بڑی بھرتی اور تیزی سے اس کا اہل کیا۔ ”نہیں ہالی..... یہ قانون کا مجرم ہے اسے قانون ہی سزا دے گا۔“

”یہ میرا مجرم ہے.....“ ہالی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ”اس نے جس طرح انسانوں کا گوشت کھایا ہے انہیں قتل کیا ہے ان کا گوشت کتوں کو کھلایا ہے“ میں بھی اس مجرم کے کھڑے کر کے اس کا گوشت کتوں کو کھانا چاہتی ہوں۔“

ہالی انتقام میں اندھی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کی حالت خراب سے بھی بدتر تھی۔ میں نے ہالی کے پاس جا کر اس سے کہا۔ ”تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے۔ رامو اپنے انجام کو پہنچ گیا۔“ ہم نے اسے بتایا کہ وہ کس طرح مرا..... قدرت نے کیسا انتقام لیا۔

ہالی نے ایک زوردار تھپڑ ڈاکٹر کے منہ پر سید کر دیا اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔ ”مردہ جیانی لیے ہیں ڈاکٹر سے بولی۔“ ”سور“ کہنے..... تم نے دیکھ لیا اپنا انجام..... کاش میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کر سکتی.....؟“

اس عرصے میں تمام مردوں اور عورتوں نے ہمیں گھیر لیا۔ لوگ مشتعل ہو رہے۔ لڑتے اور غصے سے ان کی بری حالت ہو رہی تھی۔ ہر شخص ڈاکٹر سے انتقام لینے پر تیار تھا۔ سرگوشیوں کی ایک ہتھکنڈ تھی جو فضا میں گونج رہی تھی۔ کیپٹن نے بڑی مشکل سے ہم کو قابو میں کیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر خون کی ایک بوند بھی نہیں رہی تھی۔ وہ اسے نظروں سے اٹھانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ کھلی تک وہ اس جزیرے کا بے تاج بادشاہ تھا۔ آج وہ ایک قیدی تھا۔ آج خون شکار بن گیا تھا۔

کیپٹن اور میں نے آپس میں طے کیا کہ ڈاکٹر کو کسی کمرے میں لے جا کر بند کر دیتا ہوں۔ پولیس کے آنے کے بعد اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ میں ہالی اور کیپٹن کے ہمراہ رہا۔ ہم نے اسے چلنے دیے۔ میں انہیں بتا رہا تھا کہ میں نے کس طرح ڈاکٹر

یہ لحاظ میرے لئے قابل فراموش تھے اگرچہ ہم دونوں مسلح تھے لیکن ہر آن یوں محسوس ہو رہا تھا کہ چاروں طرف سے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہونے والی ہے۔ اس کے درندہ صفت بد معاش ساتھی ہمارے جسم چھلنی کرنے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ میرے اندر بھی خوف و ہراس ساتھ ساتھ ہم میں سے اس پر پوری طرح قابو پایا ہوا تھا۔

جب ہم عمارت کے سامنے والے میدان میں پہنچے تو وہاں تشدد ہی کچھ اور تھا۔ اس میدان میں ایک طرف جزیرے کے تمام بد معاش رسیوں میں جکڑے پڑے تھے اور بہت سارے زخمی بھی تھے جو درد و اذیت سے کراہ اور تڑپ رہے تھے۔ ان کے سروں پر دو تین مسلح نوجوان کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ بہت سارے مرد لڑکیاں، عورتیں اور لڑکے میدان میں بکھرے ہوئے تھے اور آزادی اور دھوپ کا کالٹا اٹھا رہے تھے۔ اس عمارت کے آگے میں ”ہالی“ دو زسوں اور دو مردوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ ان میں ایک مرد فوجی وردی میں بلبوس تھا۔ دو قامت کے زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے۔ ہالی کی نظر سب سے پہلے ہم پر پڑی تھی۔ اس کا چہرہ حیرت اور خوشی سے دمک رہا تھا۔ پہرہ خوشی سے پھولی نہیں سائی وہ فوجی شخص کو اپنے ساتھ لے کر ہماری طرف لپکی۔

ہالی نے جیسا کہ مجھے بعد میں بتایا کہ فوجی شخص جس کا نام کیپٹن ڈاکٹر کبیر احمد ہے جو اس شبیہ کے ہسپتال میں ڈاکٹر تھا اور ہر فعال تھا وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اس نے کیپٹن کی مدد سے اس جزیرے پر قبضہ اور ڈاکٹر کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس جزیرے پر قبضہ کرنے کے لئے رامو اور پہرے داروں کو قابو میں کرنا ضروری تھا۔ جب اس کے ذہن میں کتوں کو بے ہوشی کی دوا کھلانے کی تدبیر آئی تو پھر اس نے سوچا کہ پہرے داروں کو بھی کافی میں بے ہوشی کی دوا ملا کر پلائی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر اس کا یہ تدارک منصوبہ سن کر اچھل پڑا تھا۔ اگر یہ تدبیر پہلے ذہن میں آجاتی تو اب تک ان بد نصیب لوگوں کو نجات مل چکی ہوتی۔ ہالی نے کافی میں بے ہوشی کی دوا ملائی۔ وہ جتنے پہرے داروں اور بد معاشوں کو کافی پلا سکتی تھی پلا دی۔ جب یہ سارے لوگ بے ہوش ہو گئے تو کیپٹن نے جیسے کمان سنبھال لی۔ جیل خانے کے دروازے کھول دیے گئے۔ بد معاشوں کو غیر مسلح کر کے انہیں باندھ دیا گیا اور ان کے پاس جو اسلحہ تھا وہ لڑکوں اور مردوں میں تقسیم کر دیا۔ اسلحہ کم پڑا تو اسلحہ خانے سے لے لیا گیا۔ لڑکیوں اور عورتوں کو بھی آزاد کر دیا گیا۔ انہوں نے چاقو اور چھری سنبھال لئے پھر ساری رات آپریشن ہو رہا۔ بد معاشوں کو جن جن کر گرفتار کیا۔ ان میں سے کچھ نے مزاحمت کی تو وہ زخمی ہو گئے۔ دو ایک بد معاش فرار

کو قابو میں کیا اور یہ لڑاکا اقبال کون ہے اور وہ کیسے ڈاکٹر کے ہاتھ لگا۔ اقبال ہمارے پیچھے پیچھے ڈاکٹر کو لئے چلا آ رہا تھا۔

ہم تینوں نے بمشکل میں جینٹس قدم طے کئے ہوئے اچانک فغا میں ایک دردناک جع بلند ہوئی۔ ہم تینوں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ یہ جع ڈاکٹر کی تھی ایک آدمی نے اقبال کے ہاتھ سے پھر اچھین کر ڈاکٹر کی پشت میں گھونپ دیا تھا پھر اس پردس میں لوگ ٹوٹ پڑے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ وہ مسلح تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چاقو اور خنجر تھے۔ ڈاکٹر کی دردناک چیخیں فضا کو دھلانے لگیں۔ میں اور کیپٹن ڈاکٹر کو بچانے کے لئے بڑھے تو جھوم نے ہمیں کھینچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ ان پر جنوں سوار ہو چکا تھا۔ وہ اندھے ہو رہے تھے 'انتقام لینے کے لئے۔ ان پر قابو پانا دشوار تھا۔ ہم دونوں ایک طرف بے بس سے کھڑے ڈاکٹر کا ہیما یک انجام دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد جھوم چھٹا تو یک ایسا دل خراش منظر نظروں کے سامنے تھا کہ دوبارہ دیکھنے کی جھ میں ہمت نہ رہی۔ ڈاکٹر کی لاش کے ٹکڑے کر دیئے گئے تھے اور وہ زمین پر چاروں طرف بکھرے پڑے تھے اور صربائی لپک کرکتوں کے پاس گئی ان کی زنجیریں کھول کر ڈاکٹر کی لاش کے ٹکڑوں کے پاس لے آئی تو وہ ان پر ٹوٹ پڑے۔

☆-----☆-----☆

میں ڈھاکہ انٹروپورٹ پر جہاز سے اترتا تو رندیم اور نجم النصار درکشاپور کے پھولوں کے ہار کے ساتھ میرے استقبال کے لئے موجود تھے۔ اس روز کے اور آج کے استقبال کے میں بڑا فرق تھا۔ نجم النصار کی حسین اور جمیل جیسی گمری آنکھوں میں خوشی کے آنسو موتیوں کی طرح دک رہے تھے۔ ڈھاکہ انٹروپورٹ پر اس روز خوشی ٹھیل کا جو آغاز ہوا وہ آج اس کا اختتام بھی ہو گیا تھا۔ ٹھیک اس وقت ایک دوسری کمائی نے جنم لیا۔ نجم النصار پھولوں کا ہار لئے میری طرف اور فزاندہ زبیں بڑھی اور میرے قریب پہنچ کر دی۔ پھر انہوں نے میرے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا تو اس کی آنکھوں میں محبت کے ان گنت چراغ جل اٹھے۔ پھر اس نے دنیا کی پردہا کے بغیر میرے سینے پر اپنا سر رکھ دیا اور سکنے لگی۔ میرا وجود میں اس کی محبت کی خوشبو پھیلی جلی گئی۔

☆=====ختم شد=====☆

تاہید سلطانہ اختر کے شہرہ آفاق قلم سے ایک طویل شاہکار ناول

# زندان میں پھول

چار پیارے خولے صورت بچے جو گلاب کی پنکھڑیوں سے بھی زیادہ نرم و نازک تھے

لحمہ بہ لحمہ، سطر بہ سطر، تجتیر، تجتس اور درد میں ڈوبی ایک حقیقی داستان

ایک حادثے کے نتیجے میں باپ کی محبت سے محروم ہو کر وقت اور حالات کی خستوں کے دم و دم پر پردہ جانے والے چار بہن بھائیوں کی کہانی، جن کی بد قسمتی نے ان کی اپنی ماں کو بھی ان سے بیگانہ کر دیا۔

ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ اپنے گھر میں رکھنا اور اپنے دوستوں کو تحفہ میں دینا پسند کریں گے

اپنے قریبی بکسٹال یا باہر کے طلب فرمائیں یا براہ راست منگوانے کے لئے کتاب کی قیمت اور ڈاک خرچ ادارہ کے نام میں آرڈر یا ڈرافٹ بنا کر ارسال کریں

بہترین کتابت و خوبصورت گروپش اور عمدہ طباعت کے ساتھ براہ راست منگوانے کا پتہ :-

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز

10/مرحانیت آروہ بازار لاہور 7247414

علی بکسٹال

نسبت روڈ، چوک میوہ پتال، لاہور